فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

جلد ۱

شمارہ ۱

ماہنامہ مفاہیم کراچی

ربیع الاول ۱۴۴۲ / اکتوبر ۲۰۲۰

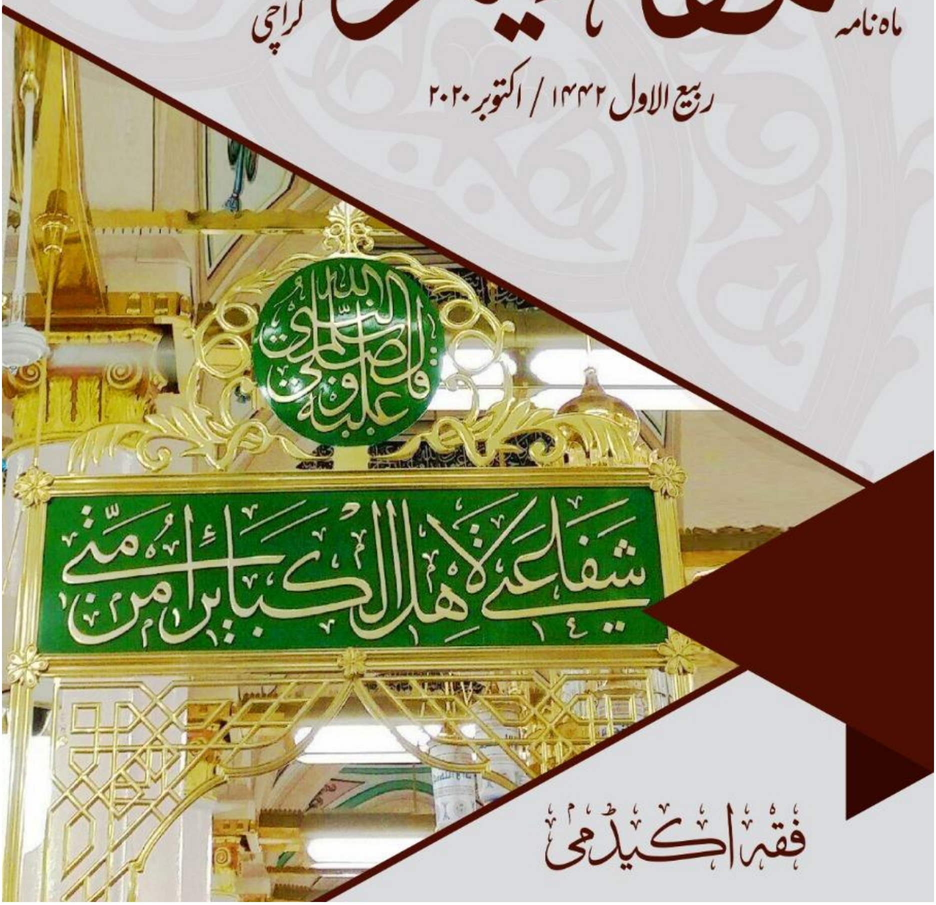

فقہ اکیڈمی

لیتفقهوا فی الدین

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

من یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب ﷾

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مضامین

اداریہ	اوصافِ نبوی ﷺ	مدیر	۴
درسِ قرآن	رسولِ اکرم ﷺ کی شفقت و محبت	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۱۱
درسِ حدیث	ابتدائے نبوت ﷺ	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۱۴
مقالات	طلوعِ آفتابِ رسالت ﷺ اور خوارق کا ظہور	مولانا محمد اقبال	۱۶
مقالات	آپ ﷺ کی پرورش: ایک منفرد نقطۂ نظر	مولانا عابد علی بھٹی	۲۱
تحریکیات	انقلاب کا نبوی طریق: چند اشکالات	عمران چھاپڑا	۲۵
ادبیات	نعت گوئی اور چند اردو نعت گو شعرا	مولانا حماد احمد ترک	۳۷
تنقیدِ مغرب	در جہانی و از جہاں بیشی	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	۷۱
یسئلونک	محفلِ میلاد	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۸۶
احوالِ امت	کشمیر، شام اور افغانستان	محمد ایاز	۹۴

مدیر

ماہنامہ مفاہیم، کراچی

اوصافِ نبوی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وآلِہٖ وَسَلَّم

قلب و نظر یا دل و نگاہ، لطائف و معارف کے حامل اور باہم مربوط ہیں۔ صاحبانِ سخن کا؛ ان دو کے واردات پر کلام اس تعلقِ نفیس کی نفاست پر شاہد ہے۔ نظر آلودۂ عشق ہو اور دل محبت آمیز ہو تو اس تعلق کی چاشنی کے بیان کو الفاظ کہاں سے لائیے۔ تو نظر خدا کی تھی اور دل مصطفی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا تو کیا کہنے۔ چنانچہ نظرِ الہی نے جب کسی محبوبِ آخر الزماں صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا انتخاب چاہا تو دلوں پہ نظر کی اور دلوں میں سب سے نیک، قلبِ محمدی علی صاحبھا الصلاۃ و السلام کو پایا[1] تو اپنا محبوب قرار دیا۔ عام طور پر محبوب، محبت پا کر اتراہی جاتے ہیں لیکن محبوبِ رحمانی علیہ السلام کے کیا کہنے کہ آپ نے عجز وانکسار کے لہجے میں فرمایا: ﴿أَلَا وَأَنَا حَبِيبُ اللهِ وَلَا فَخْرَ﴾[2] "جان رکھو کہ میں اللہ کا محبوب ہوں اور میں اس پر فخر نہیں کرتا"۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اپنے محبوب کو اپنا بنالیا تو اس اپنانے کے دو مظہر ہوئے: ﴿فَاصْطَفَاهُ لِنَفْسِهِ فَبَعَثَهُ بِرِسَالَتِهِ﴾[3] "اللہ نے انھیں اپنے لیے چن لیا اور انھیں اپنی رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا"۔ پہلے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بعثت کی شان ملاحظہ کیجیے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾[4] "ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر"۔ اسی بات کو رسول پاک صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یوں واضح کیا ﴿بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ﴾[5] "مجھے بھیجا گیا تمام سرخ وسیاہ کی طرف"۔ مجاہد رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اسود و احمر سے جن و انس مراد ہیں کہ آپ ان دونوں کی طرف مبعوث ہوئے اور بعض دوسرے اہلِ علم نے کہا کہ اس سے عرب و عجم مراد ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: "سچی بات یہ ہے کہ بیک وقت دونوں مفہوم صحیح ہیں"۔[6]

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی رسالت کے عموم کو بہت ہی عام رکھا گیا: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ شَيْءٌ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا يَعْلَمُ أَنِّي رَسُولُ اللهِ، إِلَّا عَاصِيَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ﴾[7] "زمین و آسمان کی ہر چیز مانتی ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں سوائے ناہنجار جن وانس کے"۔ محبتِ

الٰہی کا ایک ظہور ﴿فَاصْطَفَاهُ لِنَفْسِهِ﴾ کے الفاظ میں ہوا۔ اس ترکیب میں وارد "چناؤ" کا معنی یوں بیان کیا گیا: أن يكون مَظْهَرَ صِفاتِه[8] "تاکہ آپ اللہ کی صفات کے مظہر بن جائیں" تو آپ ﷺ بندۂ مولا صفات اور مظہر نورِ خدا ٹھہرے۔

اللہ کی صفات کا اظہار، اس کے اسماء سے ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ کے مظہر صفاتِ رب ہونے کا ایک مظہر یہ ہے کہ بہت سارے اسمائے نبی؛ اسمائے خداوندی سے ماخوذ ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ الرؤوف اور الرحیم ہے تو اس نے آپ ﷺ کو ﴿رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾[9] کا لقب عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ایک اسمِ عظیم النُّور ہے تو آپ ﷺ کو ﴿سِرَاجًا منيرا﴾[10] قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ الشَّهِيد ہے تو رسول اللہ ﷺ کو شاہد و شہید قرار دیا گیا ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا﴾ ﴿وَيَكُونَ الرَّسُولُ عليكم شهيدا﴾۔[11] اللہ کا ایک نام الْكَرِيم ہے تو اللہ نے آپ کو ﴿رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾[12] قرار دیا اور آپ ﷺ نے خود اپنے بارے میں فرمایا: ﴿أَنَا أَكْرَمُ وَلَدِ آدَمَ﴾[13] "میں اولادِ آدم کا سب سے کریم شخص ہوں"۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ایک اسم شریف، الاول بھی ہے تو ﴿أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾[14] پر مستزاد، متعدّد اولیتوں سے آپ ﷺ کو نوازا گیا ہے۔ ایک روایت کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ آپ ﷺ فیصلۂ نبوت میں تو پہلے ہیں لیکن بعثت میں آخری ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنِّي عِنْدَ اللهِ مَكْتُوبٌ بِخَاتِمِ النَّبِيِّينَ، وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِي طِينَتِهِ﴾[15] " میں اللہ کے پاس خاتم النبیین لکھا جا چکا تھا جب آدم اپنی مٹی میں لتھڑے تھے"۔ آخرت کے مراحل میں بھی آپ کو اولیت دی گئی ہے: ﴿أَنَا أَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الأَرْضُ﴾[16] "سب سے پہلے مجھے ہی زمین سے نکالا جائے گا"۔ میدانِ حشر کی عام بے ہوشی کے ذکر میں فرمایا: ﴿أَنَا أَوَّلُ إِفَاقَةً﴾[17] "اس بے ہوشی سے سب سے پہلے افاقہ مجھے ہی ہو گا"۔

جب کائنات اللہ تعالیٰ کے نور سے منور ہو گی تو حقیقتِ منتظر کو آشکار دیکھ کر، ہر جبینِ نیاز میں سجدے تڑپ تڑپ اٹھیں گے لیکن اس سجدۂ عالَم ہوش کا اذن سب سے پہلے ہمارے نبی ﷺ کو ہی دیا جائے گا: ﴿أَنَا أَوَّلُ مَنْ يُؤْذَنُ لَهُ بِالسُّجُودِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾[18] "قیامت والے دن سب سے پہلے مجھے ہی سجدے کا اذن ہو گا" پھر آپ کی زبان پر وہ محامد اور ثنائے حسیں کے ترانے جاری ہوں گے جو اس سے پہلے کسی پہ کھلے نہ ہوں گے، اس دن حمد کا پرچم آپ ہی نے تھاما ہو گا۔

اتنے میں محب کی محبوب کے لیے محبت جوش مارے گی تو حکم جاری ہو گا: ﴿يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ، سَلْ تُعْطَهْ، وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ﴾۔ [19]"اے محمد سر اٹھائیے... مانگیے! آپ کو دیا جائے گا، سفارش کریں قبول کی جائے گی"۔ سفارش کرنا جبکہ وہ مقبول بھی ہو اور معقول بھی، ایک اعلی منصب اور قابل فخر چیز ہے۔ لیکن میرے حضور ﷺ نے اپنے اس درجۂ رفیع کا ذکر بغیر فخر کے کیا: ﴿أَنَا أَوَّلُ شَافِعٍ وَأَوَّلُ مُشَفَّعٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ﴾ [20] "قیامت کے دن سب سے پہلے میں ہی سفارش کروں اور سب سے پہلے میری ہی سفارش سنی جائے گی اور اس میں مجھے کوئی فخر نہیں ہے"۔ اب تاریخ کی سب سے بڑی لیکن مختصر ترین سفارش شروع ہوتی ہے: ﴿يَا رَبِّ أُمَّتِي أُمَّتِي، يَا رَبِّ أُمَّتِي أُمَّتِي، يَا رَبِّ أُمَّتِي أُمَّتِي، يَا رَبِّ﴾ [21] "یارب میری امت میری امت... یارب... "۔

یہ سفارش کس کی ہو گی، خود رسول ﷺ نے بتایا: ﴿أَنَا أَوَّلُ النَّاسِ يَشْفَعُ فِي الْجَنَّةِ﴾ [22]"لوگوں میں سب سے پہلے میں ہی جنت کے معاملے میں سفارش کروں گا"۔ اب جب جنت کے "داخلے" کھلیں گے تو حکم ہو گا: ﴿يَا مُحَمَّدُ أَدْخِلْ مِنْ أُمَّتِكَ مَنْ لَا حِسَابَ عَلَيْهِمْ مِنَ الْبَابِ الْأَيْمَنِ مِنْ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ﴾ [23]"اے محمد! داہنے دروازے سے اپنے ان امتیوں کو جنت میں داخل کریں جن پر کوئی حساب نہیں ہے"۔ سبحان اللہ! رتبہ دیکھیے ہمارے پیغمبر علیہ السلام کا کہ اعلی درجے کے مستحقین جنت بھی آپ کی شفاعت کے بعد ہی جنت میں جا رہے ہیں۔ شفاعت کے اگلے ادوار میں ان لوگوں کو جنت میں داخلے کی نوید سنائی جائے گی جن کے دل میں ﴿حَبَّةٍ مِنْ شَعِيرٍ مِنَ الْإِيمَانِ﴾ "جو کے دانے کے برابر ایمان" موجود ہو گا۔ اس کے بعد جو کے نصف دانے کے برابر ایمان والوں کے حق میں سفارش قبول کی جائے گی اور اس کے بعد ان لوگوں کو شفاعت قبول کرتے ہوئے جنت کی بشارت دی جائے گی جن کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان موجود ہو گا۔ [24]

اب پلِ صراط کا مرحلہ ہے تو پل صراط کو سب سے پہلے آپ ﷺ ہی کی قدم بوسی کا شرف ملے گا: ﴿أَنَا أَوَّلُ مَنْ يُوضَعُ لَهُ الصِّرَاطُ﴾ "میرے ہی لیے سب سے پہلے پل صراط کو بچھایا جائے گا"۔ [25]اب آئی جاگتے خوابوں کی منزل، جنت کی سچی بیٹھک اور یہاں بھی آپ ﷺ ہی سبقت فرمائیں گے: ﴿أَنَا أَوَّلُ مَنْ يَقْرَعُ بَابَ الجنةِ﴾ [26]"میں ہی سب سے پہلے جنت کے دروازے پہ دستک دوں گا"۔ اب جب جنت کے دروازے کھلیں گے اور خازن آپ کو مرحبا کہے گا تو آخری

مراحل کی ایک اور اولیت کا ذکر کرے گا: ﴿بِكَ أُمِرْتُ أَنْ لَا أَفْتَحَ لِأَحَدٍ قَبْلَكَ﴾[27] "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ سے پہلے کسی کے لیے جنت کا دروازہ نہ کھولوں" جب رسول اللہ ﷺ کو اتنی "اولیات" دی گئیں تو یہ نہ سمجھیں کہ امت محروم رہی، اور اس نبیِ رحمت ﷺ کے فیض سے کیسے محروم رہ سکتی ہے کہ جس کے کلمۂ شفاعت کی ابتدا ہی ﴿أُمَّتِي أُمَّتِي﴾ سے ہوئی تھی!! چنانچہ اولیتِ محمدی علی صاحبہا الصلاۃ و السلام کے طفیل امت محمدی علی صاحبہا الصلاۃ و السلام بھی پہلی امتوں سے پہلے جنت میں جائے گی، پڑھیے فرمان رسول ﷺ مع درود: ﴿نَحْنُ الآخِرُونَ الأَوَّلُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَنَحْنُ أَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ﴾[28] "ہم (زمانی ترتیب میں) پچھلے، قیامت والے دن سب سے آگے ہوں گے اور ہم ہی جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے"۔

ان اوّلین شانوں کے حامل، مہ کامل، محمد ﷺ کا ظہور جس ماہ میں ہوا، وہ ربیع الاول ہے اور ہمارے ماہنامے مفاہیم کا بھی یہ پہلا شمارہ ہے۔ چنانچہ اول اول تذکرۂ محمدی علی صاحبہا الصلاۃ و السلام سے اپنے ماہنامے کو مشکبار کرنے کے بعد ہم یہ شمارہ، نذرِ رسالت مآب ﷺ کرتے ہیں تاکہ ہماری شروعات کے لیے خیر و برکت کا باعث ہو۔ اس شمارۂ خاص سے اگرچہ ہمارا مقصودِ اصلی تو سعادت و ثواب کا حصول ہے ورنہ کہاں ہم کہاں ثنائے خواجۂ یثرب، چاہیے کہ ہمارے قارئین بھی اسی کی نیت کریں ہاں ضمنی طور پر کچھ علمی فائدہ ہو جائے تو اسے فیضانِ محبتِ مصطفی ﷺ ہی سمجھنا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ کی ذات کا ایک پہلو تو وہ ہے جسے خیرِ قلوب کہا گیا یعنی آپ کی شخصی خوبیوں اور تعلق مع الحق کا بیان اور دوسرا وہ پہلو جسے بعثت بر رسالت کہا گیا جس کا جامع عنوان تعلق مع الخلق ہے۔ مفاہیم کے اس خصوصی شمارے میں کوشش کی گئی ہے کہ آپ ﷺ کی شخصیت کے یہ دونوں پہلو بساط بھر سامنے لائے جائیں۔ موضوعات کی ترتیب میں یہ بھی پیش نظر رہا ہے کہ وہ مواد سامنے لایا جائے جو محض علمیت کے بجائے، آپ ﷺ کی عقیدت و عظمت کو دل و دماغ پر حاوی کرنے میں معاون ہو۔

جہاں تک مفاہیم کے اجرا کی بات ہے تو ہم کوئی بہت نیا اور بہت خاص کرنے نہیں چلے بلکہ یہ ایک عام اور عاجزانہ سی کوشش ہے۔ پیش نظر یہ ہے کہ اپنے اساتذہ کرام کا فیض جہاں تک ہو سکے، احباب تک پہنچایا جائے۔ یہ سلسلۃ الذھب کی

ایک کڑی بننے کی کوشش ہے چاہے یہ کڑی پیتل ہی کی کیوں نہ ہو۔ اس کام پر ہمیں ابھارنے والا یہ فرمان نبوی ہے ﴿يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ﴾[29] ”اس علم (دین) کو ہر اگلی نسل کے عادل لوگ (اپنے پچھلوں سے) سیکھیں گے“۔

اگلوں کا پچھلوں سے ”صحیح رابطہ“ اساتذہ کے ذریعے یعنی بالمُشافَهه ہی ممکن ہے۔ البتہ کم تر درجے میں یہ رابطہ، بالمُطالَعہ بھی ممکن ہے، تو اس قیامِ ربط میں تھوڑی سے خدمت کرنے کے لیے ہم، مقالات اور منتخبات کے نام سے دو سلسلے اپنے ماہنامے میں شروع کر رہے ہیں جس میں اہلِ علم کے مختصر یا مفصل مضامین و اقتباسات پیش کرتے رہیں گے۔ فیض رسانی کے اس کام کے دوران کوشش رہے گی کہ ﴿تَحْرِيفَ الْغَالِينَ﴾ کا کچھ ازالہ کیا جا سکے، دین اور تصور دین اور اس کے فرائض و واجبات کے ثبوت و اثبات میں ”پر خلوص“ غلو کا شکار ہو کر، مسلّمہ اصولوں سے انحراف کرنے والے دوستوں کا خود پر عائد، حقِ نصیحت و خیر خواہی ادا کیا جا سکے۔

یہ بھی ہمارے پیش نظر رہے گا کہ ﴿تَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ﴾ کو مُحقَق و منقح، روایتِ علمی کی تحقیق سے روشناس کرایا جاتا رہے۔ عہدِ جدید کے تقاضوں کے مطابق اپنے سماج کی دینی تعمیر کی غرض سے تاویل و تعبیرِ جدید کا شوق کئی حلقوں میں بہت پایا جاتا ہے لیکن تاویل و تعبیر کے اصول و ضوابط سے ناواقفی... بس کچھ نہ کہیے... خاموش رہیے۔ ان دو خدمتوں کے لیے تصحیح ہائے مفاہیم اور نظریات کے نام سے دو سلسلے شروع کر رہے ہیں۔

روایت و مذہب سے انحراف دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو اس کا کُھرا مغرب میں نکلتا ہے۔ تو غرب پر تنقید کیے بغیر شرق کی بنتی نہیں ہے، اس کارِ خیر کے لیے ایک سلسلہ ”تنقیدِ مغرب“ کے نام سے شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ اس محاذ پر دادِ شجاعت دینے والے اہلِ فن کا کلام قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا رہے گا۔

دورِ جدید میں انسان تصورِ تحریک سے واقف ہوا تو ہر مذہب و ملت نے اپنے مختلف حقوق کے حصول و تحفظ کے لیے تحریکات کا پرچم بلند کیا، پھر ردِّ عمل کے طور پر بھی کئی تحریکات نے جنم لیا۔ ادھر اہلِ اسلام میں بھی تحریکوں کے دور کی ابتدا ہوئی۔ تب دین کی تحریکی تعبیر کی گئی۔ بانیانِ تحریک کے اپنے بیان کے مطابق بھی یہ تحریکیں ادھیڑ عمری کا شکار ہوئیں تو جماعتیت کے بڑھاپے سے گزر کر اب مسلک و مشرب کے جَنَم میں پیدائش کے مزے لوٹ رہی ہیں۔ خیال یہ تھا کہ تحریکِ

اسلام کو مذہب بنا دیا گیا، لہذا تحریک کا احیا کرتے ہیں اور اب خود ایک مذہب بنا بیٹھے ہیں۔ نئے علمِ کلام کی ضرورت کا احساس کیا ہوا عقائد ہی نئے کر ڈالے۔ فکر و نظریے سے بات شروع کی اور رفتہ رفتہ اسے عقیدے کے سنگھاسن پہ براجمان کیا۔ ان اصحابِ فکر و نظر سے بھی گاہے گاہے ہمارا مخاطبہ رہے گا، اسے ہم نے ''تحریکات'' کا عنوان دیا ہے۔ تحریکات سے ایک گلہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اُمت پنے کو متاثر کیا۔ اصولی جماعت سازی کے چکر میں وہ یہ بھولتے گئے کہ ''یہاں ایک اُمت بستی ہے''۔ امت کے مختلف حصوں کے تعارف و مشترکہ مفادات چاہے وہ دنیوی ہی کیوں نہ ہوں، کے تحفظ و آگاہی کے لیے ''احوالِ امت'' کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ تاکہ فرمانِ نبوی ﷺ ﴿مَنْ لَّمْ يَهْتَمَّ بِأَمْرِ الْمُسْلِمِينَ فَلَيْسَ مِنْهُمْ﴾[30] ''جو مسلمانوں کے معاملات سے دلچسپی نہ رکھے وہ مسلمانوں میں سے نہیں'' کا مصداق بننے سے بچا جا سکے۔

ادبیات کے لیے ایک گوشۂ خاص کیا گیا ہے۔ وہ جو حالی نے مسدس کے دیباچے میں لکھا کہ قوم کو ''نظم'' سے جگانے کی ضرورت ہے۔ بغیر اس بحث کے کہ حالی نے وہ ضرورت کس حد تک پوری کی اور وہ ''ضرورت'' ضروری ہے بھی یا نہیں، انسانی جمالیات اپنی تسکین چاہتی ہے اور لفظ اس کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ ''اسلامی ادب''، ادب کے معیار پر پورا نہیں اترتا، تو کیا عجب ہمارے حسن انتخاب سے کسی قدر اس کا مداوا بھی ہو جائے۔ انتخابِ ادب میں اچھے لفظ سے حظ اٹھانا تو پیشِ نظر رہے گا ہی، کوشش کی جائے گی کہ انتخاب ایسا ہو کہ دینی و ملی جذبات کی جلا اور لطیف ابحاث کی تفہیم کا کام بھی چلتا رہے۔

مفاہیم، فقہ اکیڈمی کا ترجمان رسالہ ہے اور فقہ اسلامی سے تعرض تو یہاں صبح و شام کا معمول ہے۔ اساتذہ کی بعض فقہی بحثیں، فقہیات کے نام سے ہمارے اوراق کی زینت بنتی رہیں گی جو طلبہ کے ساتھ عام احباب کے لیے بھی فائدہ مند ہوں گی۔ فقہ اکیڈمی میں ''فتاویٰ یسلونک، دار الافتاء والارشاد'' کے نام سے ایک دار الافتاء قائم ہے جو احباب کے سوالات کا جواب فراہم کرتا ہے۔ ان میں سے اہم سوالات مع جواب شائع کیے جاتے رہیں گے، اس کے لیے سوالات کے عنوان سے ایک سلسلہ شاملِ اشاعت رہے گا۔

گفتار کے غازی تو ہم خیر ہیں ہی لیکن ''عمل و کردار'' کے لحاظ سے ہم تہی دست، دست بہ دعا ہیں کہ اللہ ہم سے دین وملت

کی کچھ خدمت لے لے۔اور ہر طرح کے فتنہ و شرور سے اپنی حفاظت میں رکھے اور کسی بھی ایسے طرزِ عمل سے ہمیں محفوظ رکھے جو دین اور اہلِ دین کے نقصان کا باعث ہو۔ہم اپنے قارئین سے بھی اسی دعا کی درخواست کرتے ہیں۔

حوالہ جات:

1 مسند احمد
2 سنن ترمذی
3 مسند احمد
4 سباء:۲۸
5 مسند احمد
6 تفسیر ابن کثیر
7 مسند احمد
8 شرح الشفاء للقاری
9 التوبہ:۱۲۸
10 الاحزاب:۴۶
11 الفتح:۸،البقرہ:۱۴۳
12 الحاقۃ:۴۰
13 سنن ترمذی
14 الزمر:۱۲
15 مسند احمد
16 سنن ترمذی
17 مجمع الزوائد
18 مسند احمد
19 صحیح بخاری
20 سنن ترمذی
21 مسند احمد
22 صحیح مسلم
23 صحیح بخاری، مسند احمد
24 مسند احمد
25 جامع الکبیر
26 صحیح مسلم
27 مسند احمد
28 صحیح مسلم
29 مشکاۃ المصابیح
30 مستدرک حاکم

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفقت و محبت

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ○ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ سورۃ التوبہ: ۱۲۹-۱۲۸

"(لوگو) تمھارے پاس ایک ایسا رسول آیا ہے جو تمھی میں سے ہے، جس کو تمھاری ہر تکلیف بہت گراں معلوم ہوتی ہے، جسے تمھاری بھلائی کی دھن لگی ہوئی ہے، جو مومنوں کے لیے انتہائی شفیق، نہایت مہربان ہے۔ پھر بھی اگر یہ لوگ منھ موڑیں تو (اے رسول! ان سے) کہہ دو کہ: میرے لیے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے"۔

سورۂ توبہ میں لوگوں کے لیے باعثِ مشقت احکام، جہاد و قتال اور انفاق کا بیان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان، کفار کے مقابلے میں ان تقاضوں کی ادائی کی مشقتیں اٹھا رہے تھے، جبکہ منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دھوکہ دہی میں مشغول تھے۔ اب سورت کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بیان کی گئی جس میں ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کا سامان ہے اور دوسری طرف اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم کی دلجوئی ہے کہ جس قائد اور مقتدا کی پیروی میں مشکلات جھیل رہے ہیں وہ عظیم تر ہیں اور آپ کی پیروی کے واسطے اس شرف میں حصے دار ہوں گے اور تیسری طرف کفار و منافقین کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ کس عالی شان شخصیتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت و غدر کے مرتکب ہو کر شرف ابدی سے محروم ہو رہے ہیں۔

صفاتِ محمدی علی صاحبہا الصلاۃ و السلام

﴿مِنۡ أَنۡفُسِكُمۡ﴾

''تمھی میں سے ہیں''۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یہ لفظ فا کے زبر کے ساتھ أَنۡفَسِكُمۡ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی آپ ﷺ سب سے زیادہ نفیس ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمھارے ہم جنس یعنی بشر ہیں۔ پھر ہم نسل و ہم زباں ہیں اس لیے آپ کی باتوں کو سمجھنا اور نمونہ بنانا آسان ہے۔

آپ ﷺ حسب و نسب میں بھی عالی شان ہیں۔ بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ: عرب کے ہر قبیلے سے قریش کا کوئی نہ کوئی تعلق بنتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری پیدائش، اسلام کی طرح کے نکاح کے ذریعے سے ہوئی نہ کہ جاہلیت کی بدکاری سے (سنن الکبری، بیہقی) اور یہ بھی فرمایا کہ میرا نسب، میرے ماں باپ سے لے کر آدم علیہ السلام تک جاہلیت کی بدکرداریوں سے محفوظ چلا آیا ہے۔ (المعجم الاوسط) پھر یہ کہ آپ ﷺ سب سے زیادہ اللہ کے اطاعت گزار اور اخلاق میں سب سے اعلی و ارفع ہیں۔

﴿عَزِيزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ﴾

یعنی جو چیز آپ کے مخاطبین کے لیے باعثِ مشقت ہو وہ آپ پر بھی شاق گزرتی ہے۔ آپ ﷺ کی ساری دعوت و شریعت باعثِ رحمت و دافعِ مضرت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے تو سہولت و کشادگی ہی کے ساتھ مبعوث کیا گیا اور آپ نے اپنے لائے ہوئے دین کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ دین تو ہے ہی آسان۔

﴿حَرِيصٌ عَلَيۡكُمۡ﴾

رسول اللہ ﷺ کی بے انتہا رغبت کو حرص سے تعبیر کیا گیا یعنی آپ لوگوں کی ہدایت اور دنیاوی اور اخروی فوائد بہم پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جنت کے قریب لے جانے والی اور دوزخ سے دور کرنے والی ہر چیز میں نے تمھارے لیے واضح کر دی (المعجم الکبیر) اور آپ ﷺ نے مثال دیتے ہوئے فرمایا: ''تم پتنگوں کی طرح آگ میں گھسے جا رہے ہو اور میں تمھارے کپڑوں سے کھینچ کر تمہیں پیچھے ہٹا رہا ہوں''۔ (مسند احمد)

﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾

یعنی آپ رحمت میں بہت شدید ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ تعالی نے یہاں اپنے ناموں میں سے دو نام (یعنی رؤوف اور رحیم) اپنے رسول کو عطا کیے۔ رافت و رحمت کا منبع ذاتِ باری تعالی ہے ﴿وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ﴾ حدیث کے مطابق اللہ تعالی نے اپنی رحمت کا ایک حصہ اپنی تمام مخلوق میں تقسیم کر دیا، تو کہا جا سکتا ہے کہ اس رحمت میں سے ایک بڑا حصہ رحمتِ محمدی علی صاحبھا الصلاۃ و السلام ہی ہے، اسی لیے اللہ تعالی نے فرمایا ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ (آل عمران:۱۵۹) ''اللہ کی رحمت کے سبب اے نبی! آپ ان لوگوں کے لیے نرم خو ہیں''۔

اگلی آیت میں فرمایا کہ اگر رسول اللہ کی اتنی صفات جان کر بھی لوگ آپ پر فدا نہ ہوں تو اے نبی ان کی پروانہ کریں، اللہ آپ کو کافی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں آپ اسی پہ توکل کریں اور وہ عرش عظیم کا رب آپ کی پشت پناہی کرے گا تو آپ کو مخالفین و معاندین کی کوئی چال نقصان نہیں دے سکے گی۔

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ ''پھر بھی اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو (اے رسول! ان سے) کہہ دو کہ: میرے لیے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے''۔ رسول اللہ ﷺ نے اس دعا کے بارے میں فرمایا کہ جو شخص یہ دعا صبح و شام سات بار پڑھ لیا کرے تو اللہ اس کے دین و دنیا کی مشکلات کو دور فرما دے گا۔

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

ابتدائے نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

﴿عَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ، مَا كَانَ بَدْءُ أَوَّلِ أَمْرِكَ؟ قَالَ: دَعْوَةُ إِبْرَاهِيمَ، وَبُشْرَى عِيسَى، وَرَأَتْ أُمِّي أَنَّهُ يَخْرُجُ مِنْهَا نُورٌ أَضَاءَتْ مِنْهُ قُصُورُ الشَّامِ﴾ (مجمع الزوائد وقال الهيثمي رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ)

سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے کہا: اے اللہ کے نبی! آپ کے معاملے کی ابتدا کیا تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا، عیسی علیہ السلام کی بشارت اور میری ماں نے ایک نور دیکھا، جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے''۔

مراد یہ ہے کہ نبی آخر الزماں کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعین ابتدائے آفرینش سے ہو چکا تھا۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ میں اللہ کے ہاں خاتم النبیین لکھا جا چکا تھا جب کہ آدم اپنے گارے میں لتھڑے ہوئے تھے اور ایک روایت میں آیا ہے میں اس وقت نبی بنایا گیا تھا جب آدم روح و جسم کے درمیان تھے۔ اس آسمانی فیصلے کا اظہار حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں ہوتا ہے جو انھوں نے تعمیرِ کعبہ کے وقت اپنی نسل کے لیے کی تھی: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ﴾ ''اے ہمارے رب ان میں بھیج ایک رسول انہی میں کا''۔ اس فیصلۂ خدائی کا ایک مظہر حضرت عیسی علیہ السلام کے الفاظ ہیں جو انھوں نے بنی اسرائیل کو بشارت دیتے ہوئے ارشاد فرمائے تھے: ﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ ''اور میں بشارت دینے والا ہوں اپنے بعد ایک رسول کی جس کا نامِ نامی احمد ہے''۔

اب عالمِ خلق میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کا مرحلہ آتا ہے کہ ولادتِ بابرکت کے موقعے پر جب آپ کا جسمِ اطہر، تنِ

مادر سے جدا ہوا تو ایک روشنی دکھائی دی گئی جس سے شام کے محلات روشن ہوگئے۔ یہ روشنی گویا آپ ﷺ کے نورِ نبوت و ہدایت کا ایک استعارہ تھی اور شام کے محلات کے روشن ہونے میں یہ ایک طرف تو آپ ﷺ کی نبوت کی وسعت کی طرف اشارہ ہے اور دوسری طرف یہ کہ آپ ﷺ کی نبوت سے وقت کی مملکتیں ہلاک اور ان کے زیر سرپرستی فروغ پانے والے شرک و جہالت کے اندھیرے چاک ہوجائیں گے۔

(مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، كِتَابُ عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ ، بَابُ قِدَمِ نُبُوَّتِهِ ﷺ)

* * * * *

مولانا محمد اقبال
رکنِ شعبہ تحقیق و تصنیف

طلوعِ آفتابِ رسالت ﷺ اور خوارق کا ظہور

مشہور و معروف قول کے مطابق شہنشاہِ کونین ﷺ ۱۲ ربیع الاول کو مکہ میں صبحِ صادق کے وقت ابوطالب کے مکان میں پیدا ہوئے، لیکن جمہور مورخین اور محدثین کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ ولادتِ باسعادت کی تاریخ ۸ ربیع الاول یوم دوشنبہ، اپریل ۵۷۰ عیسویں ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے،[1] جبکہ علامہ شبلی رحمہ اللہ نے مصر کے مشہور ہیئت دان محمود پاشا کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کی ولادت ۹ ربیع الاول بروز دوشنبہ، ۲۰/اپریل ۵۷۱ عیسویں میں ہوئی۔[2]

آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو اس سے پہلے اس کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں، صبحِ صادق کے آتے ہی کالی رات کی تاریکیاں گم ہوجاتی ہیں، اندھیرے چھٹ جاتے ہیں، تھوڑی دیر میں سورج کی ضیا بار کرنیں عالم کو منور کرنے لگتی ہیں۔ رسالت مآب ﷺ کے دنیا میں آنے سے پہلے خوارق کا سلسلہ چل نکلا، جو در حقیقت نبوت و رسالت کے مبادی اور مقدمات ہوتے ہیں، جس کو اصطلاح میں ارہاص کہا جاتا ہے۔

حضورِ پر نور ﷺ کی آمد کے قریب خرقِ عادت امور رونما ہونے لگے، حضورِ اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت سے تقریبا پچپن روز پہلے ابرہہ کی لشکر کشی کا واقعہ پیش آیا۔ اللہ تعالی نے مکہ کے رہنے والوں کو اس کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہونے سے بچایا اور لشکرِ ابرہہ کو ابابیل کے ذریعے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔[3] یہ گویا آپ ﷺ کے دنیا میں آنے سے پہلے غیبی اشارہ تھا۔ ابرہہ کے مقابلے میں قریش کی مدد و نصرت اس وجہ سے نہیں کی گئی تھی کہ وہ حق کے پیرو

تھے، بلکہ ابرہہ دینِ مسیحی کے حامل ہونے کی وجہ سے قریش کی بنسبت حق کے زیادہ قریب تھا۔ یہ مددِ خداوندی اور نصرتِ الٰہی اس بات کی علامت تھی کہ اس قبیلے اور اس شہر میں نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد آمد ہے، اسی نسبت سے یہ ایک غیبی اعلان تھا۔

حضرت عثمان بن العاص رضی اللہ عنہ کی والدہ فاطمہ فرماتی ہیں کہ میں حضور ﷺ کی ولادت کے وقت آمنہ کے پاس تھی، اس وقت میں نے دیکھا کہ گھر نور سے بھر گیا اور آسمان کے ستارے جھکے ہوئے آتے ہیں یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ یہ ستارے مجھ پر آگریں گے۔[4] حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں حضرت آمنہ نے حضور ﷺ کی ولادت کے وقت ایک نور مشاہدہ کیا جس سے ملک شام کے محلات روشن ہوگئے۔[5] مؤرخین اور اصحابِ سیر نے بیان کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت کی رات ایوانِ کسریٰ میں زلزلہ آیا جس سے محل کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس جو سالہا سال سے روشن تھا بجھ گیا اور دریائے ساوہ خشک ہوگیا۔[6]

علامہ شبلی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ روایت درست نہیں ہے اس لیے کہ بخاری و مسلم حتیٰ کہ صحاحِ ستہ میں اس کا کوئی پتا نہیں ملتا، لیکن ان کی یہ دلیل بہت کمزور معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ روایت درجۂ استناد کو پہنچتی ہے، ضروری نہیں کہ صحیح ہونا صحاحِ ستہ پر موقوف ہو، بلکہ صحاحِ ستہ کے علاوہ بڑی تعداد میں صحیح احادیث پائی جاتی ہیں، جن سے علامہ شبلی نے خود بھی استدلال فرمایا ہے۔ مذکورہ روایت کی اصحابِ سیر نے تحسین کی ہے، یہ درجۂ شہرت کو پہنچی ہے اس لیے اسے جھٹلانا مشکل ہے۔ البدایۃ والنہایۃ میں یہ روایت سندِ متّصل کے ساتھ منقول ہے، کہتے ہیں کہ زلزلے اور محل کے کنگرے گرنے سے کسریٰ بہت پریشانی کے عالم میں تھا، اس نے ارکانِ دولت کو جمع کرکے دربار منعقد کیا، ابھی تک مجلس برخاست نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے اطلاع دی کہ فارس کا آتش کدہ جو ہزار سال سے روشن تھا بجھ گیا ہے، ادھر سے موبذان نے اپنا خواب جو اسی رات کو دیکھا تھا بیان کیا کہ سخت قوی اونٹ دریائے دجلہ کو پار کرتے ہوئے عربی گھوڑوں کو کھینچے لیے جارہے ہیں اور تمام ممالک میں پھیل گئے ہیں۔ کسریٰ نے تعبیر پوچھی تو موبذان نے کہا: ”معلوم ہوتا ہے عرب کی طرف سے کوئی عظیم الشان حادثہ پیش آنے والا ہے“۔ کسریٰ نے تحقیق کے لیے نعمان بن منذر کو لکھا: ”اپنے

علاقے سے کسی ماہر عالم کو میرے پاس بھیجو، تاکہ وہ میرے سوالات کا جواب دے"۔

نعمان نے ایک بڑے اور معتمد عالم عبد المسیح غسانی کو بھیجا۔ جب وہ حاضرِ خدمت ہوا تو بادشاہ نے پوچھا: "آپ میرے سوالات کا جواب دے سکتے ہیں یا نہیں؟"۔ اس نے کہا: "آپ دریافت فرمائیں، اگر مجھے جواب دینے میں مشکل درپیش ہوئی تو میں اپنے ماموں سطیح سے معلوم کرلوں گا"۔ بادشاہ نے تمام واقعہ سنایا، تو عبد المسیح نے کہا: "مجھے اس کا علم نہیں ہے، البتہ میں اپنے ماموں سطیح جو شام میں رہائش رکھتے ہیں اور بڑے عالم ہیں سے معلوم کرلوں گا، ممکن ہے وہ اس کا جواب دیں"۔ بادشاہ نے عبد المسیح کو تحقیق حال کے لیے سطیح کے پاس بھیج دیا۔

عبد المسیح اپنے ماموں سطیح کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ قریب المرگ تھا۔ عبد المسیح نے جاکر سلام کیا اور کچھ اشعار پڑھے، سطیح نے عبد المسیح کو پہچان لیا، اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: "عبد المسیح تیز اونٹ پر سوار ہوکر سطیح کے پاس پہنچا اس حال میں کہ سطیح مرنے کے قریب ہے، تجھے بنی ساسان کے بادشاہ نے محل کے زلزلے، آتش کدۂ فارس کے بجھ جانے اور موبذان کے خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے واسطے بھیجا ہے، تو اے عبد المسیح! یاد رکھ، جب کلامِ الٰہی کی تلاوت کثرت سے ہونے لگے، صاحبِ عصا ظاہر ہو، وادیٔ سماوہ جاری ہوجائے، دریاے ساوہ خشک ہوجائے اور فارس کا آتش کدہ بجھ جائے تو سطیح کے لیے شام، شام نہ رہے گا۔ بنی ساسان کے چند مرد اور چند عورتیں بقدر کنگروں کے حکومت کریں گے اور جو بات ہونے والی تھی وہ ہوگئی، یہ کہتے ہی سطیح دنیا سے رخصت ہوا"۔ عبد المسیح وہاں سے واپس ہوا۔ کسریٰ کو اس مکالمے سے آگاہ کیا، کسریٰ نے جب یہ سنا تو کہا کہ چودہ سلطنتوں کے گزرنے کے لیے بڑا عرصہ چاہیے، جب کہ زمانہ بہت جلد گزر گیا۔ نوشیرواں کے بعد یکے بعد دیگرے چودہ سلطنتیں گزر گئیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت تک کسریٰ کے آخری تاجدار یزدگرد پر سلطنتِ کسریٰ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی، قصۂ پارینہ بن گئی۔[7]

قیصر کو بھی نبی اخر الزماں ﷺ کی خبریں ملیں، اس نے بھی تحقیق کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نبی برحق ہیں۔ قبولِ اسلام کا ارادہ بھی کیا لیکن سلطنت پاؤں کی بیڑی بنی رہی۔ حضور ﷺ کے خط اور سفیر کی تعظیم کی برکت سے سقوطِ

ریاست سے تو محفوظ رہا لیکن اسلام نہ لانے کی فوری سزا کے طور پر مقبوضات سے محروم ہو کر زوال پذیر ہو رہا۔ اور مصنف ابنِ ابی شیبہ کے مطابق حضور ﷺ نے خبر بھی یہی دی تھی کہ روم ﴿ذَاتُ الْقُرُونِ﴾ بہت سارے سینگوں والا ہے، ایک کے ٹوٹنے کے بعد دوسرا نکلتا رہے گا۔

بازنطینی سینگ عثمانیوں نے توڑا تو برطانوی سینگ عثمانیوں کو توڑنے میں کامیاب رہا۔ اب جبکہ عثمانی دوبارہ بیدار ہو رہے ہیں تو دیکھتے ہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ لیکن کیا ہم دیکھتے ہی رہیں گے؟ ہم ماضی میں کیا کیا کرتے تھے؟ ہم عثمانیوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہوئے تھے۔ اب بھی ہمیں ان کا دست و بازو بننا ہوگا لیکن اس کے لیے ہمیں اسلام کی پناہ میں آنا ہو گا۔ پھر ہم دنیا کو وہی پیغام دے سکتے ہیں جو عامر بن ربعی رضی اللہ عنہ نے سر دربار رستم دیا تھا ”اللہ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم اس کی مرضی کے مطابق، اللہ کے بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر ذاتِ وحدہ لاشریک کی بندگی میں دے دیں، دنیا کی تنگی اور گھٹن سے نکال کر آزاد فضا میں لے آئیں اور دوسرے ادیان کے ظلم وجور سے نجات دلا کر اسلام کے عدل وانصاف کے دامن میں جگہ دیں“۔[8]

اور ہمیں مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ کے اس ملفوظ کو بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ ”ہمیں کسی نئے دین کی ضرورت نہیں بلکہ اس دین پر نئے ایمان کی ضرورت ہے، ہمیں کوئی نیا پیغام درکار نہیں بلکہ اسی پیغام کے لیے جوش اور ولولے کی ضرورت ہے، اسلامی تشخص کو قوت پہچانے اور اسے مزید ترقی دینے کی ضرورت ہے“۔[9] تاکہ مادیت کے اس پر آشوب دور میں دنیا ایک بار پھر روحانیت سے روشناس ہو اور آفتاب رسالت ﷺ کی ضیا بار کرنوں سے منور ہو۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

حوالہ جات:

١ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سیرتِ مصطفی، جلد اول، ص:٢٧

2 علامہ شبلی نعمانی، سیرت النبی ﷺ، جلد اول

3 مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سیرتِ مصطفی، جلد اول، ص:٢٤

4 مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سیرتِ مصطفی، جلد اول، ص:٢٤

5 مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سیرتِ مصطفی، جلد اول، ص:٢٤

6 البدایۃ والنہایۃ، جلد اول، ص:٦٧٣، مکتبہ فریدیہ

7 عیون الاثر، جلد اول، ص:٢٩، طبقات ابن سعد، جلد اول، ص:٩١، ابن حجر عسقلانی، الاصابۃ فی تمییز الصحابہ، جلد ششم، ص:٣٣٥، مکتبہ رحمانیہ

8 البدایہ و النہایہ، جلد چہارم، ص:٤٣

9 دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، ص:٧٥

* * * * *

مولانا عابد علی بھٹی

استاذ فقہ اکیڈمی

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش: ایک منفرد نقطۂ نظر

سرورِ عالم سید ولدِ آدم حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن مبارک سیرت نگاری کا اہم موضوع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اخص الخاص بنایا اور یہ منظور نہیں فرمایا کہ کوئی کسی بھی درجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بھی اعتبار سے بلند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کا ابتدا سے انتہا تک خود ہی انتظام فرمایا۔ دنیا کے کسی شخص کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استاد ہے یا کسی نے آپ کی تربیت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدِ ماجد کا انتقال آپ کی ولادت سے قبل ہی ہو گیا، اور چھ برس کی عمر میں والدہ ماجدہ بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اس کے بعد عموماً سیرت نگاروں نے یہ بات درج کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش آپ کے چچا اور دادا نے کی مگر حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی صاحب رحمہ اللہ نے اس بارے میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش انھوں نے نہیں بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے براہِ راست فرمائی، اور ساتھ ہی ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ان سب کو بھی کئی نعمتوں سے نوازا۔

عرب میں یہ دستور تھا کہ شرفا اپنے شیر خوار بچوں کو ابتدا ہی سے دیہات میں بھیج دیتے تھے، تاکہ دیہات کی صاف وشفاف آب وہوا میں ان کی نشوونما ہو اور وہ فصیح زبان اور عرب کا اصلی تمدن سیکھ سکیں اور عربی خصوصیات ان سے علیحدہ نہ ہوں۔ یہاں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کا احسان مند نہیں بنایا کہ کوئی آپ کی تربیت کرتا، بلکہ آپ کے لیے ان خاتون کا بندوبست فرمایا، جن کے حالات کے بارے میں آتا ہے کہ ان کی سواری ایک لاغر اور دبلی گدھی اور ایک اونٹنی جس کا حال یہ تھا کہ اس سے ایک قطرہ دودھ نہیں نکلتا تھا، بھوک کی وجہ سے رات بھر سو نہیں سکتے تھے، بچے کا یہ حال تھا کہ

رات بھر بھوک کی وجہ سے روتا اور بلبلاتا۔ ان کا اپنا دودھ اتنا نہ تھا کہ ایک بچہ سیر ہوسکے۔ آپ ﷺ کو تمام عورتوں پر پیش کیا گیا، لیکن یتیم ہونے کی وجہ سے کوئی آپ کو لے کر نہیں گیا، انھیں کیا معلوم تھا کہ وہ یتیم نہیں بلکہ دُرِّ یتیم ہیں اور یہی وہ مبارک مولود ہیں، جن کے ہاتھوں میں قیصر و کسریٰ کے خزائن کی کنجیاں رکھی جانے والی ہیں، لہذا جب کسی نے آپ کو نہیں لیا تو حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا آپ کو لے گئیں، کہ ان کو خالی ہاتھ جانا شاق معلوم ہوا۔ جیسے ہی آپ ﷺ کو انھوں نے لیا، ان کی دنیا ہی تبدیل ہوگئی۔ برکتوں کے دروازے ان پر کھل گئے۔ اس مولودِ سعید کا گود میں لینا تھا کہ خشک پستان دودھ سے بھر گئے اور اتنا دودھ کہ آپ ﷺ بھی سیر اب ہوئے اور آپ کے رضاعی بھائی بھی سیر ہوگئے۔ اونٹنی کا دودھ دوہنے کے لیے اٹھیں تو دیکھا کہ دودھ تھن سے بھرے ہوئے ہیں، تو انھوں نے اور ان کے شوہر نے بھی سیر ہوکر دودھ پیا۔ یہ تو ابتدا تھی، پھر جتنا عرصہ آپ وہاں رہے، برکتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ دو سال بعد جب واپس لوٹانے کا وقت آیا تو انھوں نے آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ سے درخواست کی کہ انھیں مزید میرے پاس رہنے دیا جائے۔

والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد آپ ﷺ اپنے دادا کے پاس رہے اور ان کے انتقال کے بعد آپ ﷺ کے چچا نے ان کو اپنی کفالت میں لیا۔ آپ ﷺ جب ان حضرات کے پاس گئے، اس وقت ان کی معاشی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ آپ ﷺ کی کفالت کرتے، اس کے برعکس جو لوگ ان کی کفالت میں پہلے سے تھے ان کا معاشی بوجھ اٹھانا بھی ان کے لیے آسان نہ تھا۔ آپ ﷺ کے چچا کے بھی معاشی حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ آپ ﷺ کی پرورش کرتے، بلکہ وہ اپنے بچوں کی کفالت نہیں کرپا رہے تھے، جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کی پرورش میں دے دیا تھا۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ جیسے آپ ﷺ کی حفاظت اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے ذمے لی تھی یعنی آپ ﷺ کی اس دنیا میں آمد سے قبل مکے کی ابرہہ سے حفاظت فرمائی، یہود نے آپ ﷺ کو زہر دیا تو اللہ نے آپ ﷺ کی زہر کے اثر سے حفاظت فرمائی، اسی طرح اصلاً آپ ﷺ کی معاشی کفالت اور پرورش کی ذمے داری بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے ہی لی تھی۔

یہ تو تھا نبی کریم ﷺ کی پرورش کے بارے میں مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب رحمہ اللہ کے نقطۂ نظر کا خلاصہ، اب ہم گیلانی صاحب کے رسالے "النبیّ الخاتم" سے ان کی متعلقہ عبارات نقل کرتے ہیں:

والدین کی وفات

پھر دیکھو! جس کا باپ مرجاتا ہے تو جھوٹی قوتوں کے ماننے والے گھبرا گھبرا کر چلاتے ہیں، واویلا مچاتے ہیں کہ اس بچے کو کون پالے گا؟ بے زوری کو زور کہنے والوں کا زور توڑنے کے لیے خود اس کے ساتھ یہ دیکھا گیا کہ پیدا ہونے کے بعد نہیں بلکہ اس سے پہلے کہ وہ آئے، اس میدان میں آئے جہاں جھوٹی قوتوں سے آزادی کا پرچم کھولا جائے گا، وہ دھوکے کی اس قوت سے آزاد ہو گیا جس کا نام دنیا نے باپ رکھا ہے۔ اور ٹھیک جس طرح ظہور سے پہلے اس کی ہستی نے اس آزادی کی شہادت ادا کی، نمود کے ساتھ ہی چند ہی دنوں کے بعد اس غلط بھروسے کا تکیہ بھی اس کے سر کے نیچے سے کھینچ لیا گیا جس کو ہم سب ماں کہتے ہیں۔

عبدالمطلب کی کفالت اور ان کی وفات

جو اپنی جوانی کی قوتوں کو کھو کر بڑھاپے کی ہلی ہوئی دیوار کے سہارے زندگی کی نمائش ختم کر رہا تھا، اس کی پیرانہ سری کے ساتھ آپ کے جد امجد نے چاہا تھا کہ سچی آزادی کی واشگاف ہونے والی حقیقت میں کچھ اپنی شرکت سے اشتباہ ڈال دیں، لیکن جو اپنے دعویٰ کی خود دلیل تھا اس کی دلیل کمزور ہو جاتی اگر عین وقت پر عبدالمطلب کی سرپرستی کے فریب کا پردہ چاک نہ کر دیا گیا ہوتا، آخر وہ بھی چاک کر دیا گیا۔

ابوطالب کی کفالت

حقیقت جتنے بیّن اور شاندار چہرے کے ساتھ اب اس بے مادر پدر اور لاوارث یتیم کی پیشانی سے چمک رہی تھی، وہ نہ چمکتی، اگر کہیں بجائے بے مایہ و بے بضاعت عم محترم حضرت ابوطالب کے خدانخواستہ آپ کی نگرانی مکہ کے ساہوکار عبدالعزیٰ المشہور بأبي لھب کے سپرد ہوتی، لیکن شیر کے بچے لومڑی کے بھٹوں میں نہیں پالے جاتے، جس قطرے کی قسمت میں موتی ہونا ہے وہ گھونگھوں اور مینڈکوں کے منھ میں نہیں گرتا۔

غریب ابوطالب کی کفالت سے اس کے برہانی وجود میں کیا ضعف پیدا ہوتا جس کے متعلق شاید بہتوں کو علم نہیں ہے کہ مدتوں ان کی یعنی ابوطالب کی گزران ان قراریط پر ہی تھی جو بکریوں اور اونٹوں کے چرانے کے صلے میں ان کا یتیم بھتیجا مکہ

والوں سے مزدوری میں پاتا تھا۔ کیسی عجیب بات ہے جو اپنے حقیقی بچوں کی پرورش کا بوجھ بھی اپنے سر پر نہیں اٹھا سکتے تھے اور اسی لیے مجبورًا جعفر، عباس کی اور علی اس کی گود میں ڈال دیے گئے جن کی گود میں وہ پلنے کے لیے پیدا ہوئے تھے تو پھر یہ کیسا بے بنیاد وہم ہے کہ جس کو خود قدرت کا ہاتھ براہِ راست پال رہا تھا، اس کی پرورش کی تہمت اس کے سر جوڑی جاتی ہے جس کی، اگر سمجھا جائے تو شاید عمر کا ایک بیشتر حصّہ اسی کے بل بوتے پر گزرا جوان کا پروردہ سمجھا جاتا ہے۔

دائی حلیمہ سعدیہ

فہموں کی قلابازیاں اس مسئلہ میں بھی تقریبًا اسی قسم کی ہیں جو حلیمہ سعدیہؓ کے متعلق سمجھ کے پھیر سے بلاوجہ پیدا ہوئیں۔ آپ کو حلیمہ سعدیہ سے دودھ ملا؛ یا حلیمہ کی اونٹنی، حلیمہ کی بکریوں، حلیمہ کے شوہر، حلیمہ کے بچوں، بلکہ آخر میں قبیلے والوں تک کو، ان سب کو دودھ آپ ﷺ ہی کے ذریعے سے ملا؟ اس میں واقعہ کیا ہے اس کو سب جانتے ہیں، لیکن نہیں جانتے یا نھیں جاننا چاہتے!!

*****

عمران چھاپڑا
استاذ فقہ اکیڈمی

انقلاب کا نبوی طریق: چند اشکالات

کیا آپ سنت و سیرت کی پیروی کرتے ہیں ؟ اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ آپ کے یہاں پیروی کے اصول کیا ہیں؟ عالمِ اسلام میں سنت و سیرت کی پیروی کا جذبہ، از سرِ نو، جوں جوں پروان چڑھتا گیا مختلف اطرافِ حیات میں سنت و سیرت کی تحقیق و تدقیق کے در کھلتے گئے اور یوں پیرویِ سنت کا کہہ لیں؛ ایک نیا میدان "منہجِ انقلاب" بھی سامنے آیا۔ اس ضمن میں بعض معاصر تحریکوں کے لٹریچر میں امام مالک رحمہ اللہ سے منسوب یہ قول بہت بیان کیا گیا:

لا يُصْلِحُ آخِرَ هَذِهِ الأُمَّةِ إِلا مَا أَصْلَحَ أَوَّلَهَا "اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر اس طریقے پر کہ جس پر اس کے پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی"۔ علامہ جوہری رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق یہ امام کے ایک شیخ وھب بن کیسان المودب رحمہ اللہ کا قول ہے: امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: شیخ کی مراد کیا تھی؟ فرمایا: يُرِيدُ التُّقَى ان کی مراد تقوی سے تھی۔ (مسند الموطأ للجوهري المالكی)

امت کی "اصلاح" کے اس منطقی اصول پر مشتمل اس دلیلِ مالکی کو "طریقِ انقلاب" کے لیے بنیاد بناتے ہوئے کہا گیا کہ انقلابِ اسلامی یا قیامِ ریاستِ اسلامی کا طریقہ سیرتِ رسول ﷺ سے ماخوذ ہونا چاہیے۔ اولا سیرت سے انقلاب کے اصول و فلسفہ کے اخذ کی بات کی گئی جو رفتہ رفتہ انقلاب کے ہر مرحلے میں؛ مِن و عن پیروی تک پہنچی۔ سوائے اس مرحلے کے کہ جس میں "اجتہاد" ناگزیر ہو جائے۔ چنانچہ اس استشہاد و اجتہاد کے بعد ایک منہجِ انقلاب ترتیب دیا گیا اور اسے منہجِ انقلابِ نبوی کا نام دیا گیا۔ اب اسے امتِ مسلمہ کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیا گیا اور امت کی اس طریقِ انقلاب سے

ناواقفی پر تاسف کا عام اظہار کیا جانے لگا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس مخصوص طریقِ انقلاب کو چھوڑ کر دعوت و تبلیغ، علمی و تعلیمی کام یا انتخابات سے کامیابی کو مشکوک قرار دیا گیا۔

سیرتِ نبوی ﷺ سے منہجِ انقلاب کی تشکیل کا اصول یہ بیان کیا گیا کہ سیرت کا مطالعہ معروضی طور پر (objectively) کیا جائے اور پھر سیرتِ مطہرہ کے حالات و واقعات کو خاص سے عام (generalize) کر کے اصول و مبادی مستنبط کیے جائیں اور ان کی روشنی میں انقلابی عمل کے مراحل و مدارج اور لوازم طے کیے جائیں۔

اس تعبیر اور طرزِ تعبیر پر کچھ گذارشات عرض کرنا پیشِ نظر ہے۔ ہماری گزارشات تین اطراف سے ہوں گی: ایک تصورِ سیرت و سنت کے بارے میں، دوسرے معروضیت (objectivity) کے بارے میں اور تیسرے عموم (generalization) کے بارے میں۔

ایک اہم اصولی بات

ہم ایک اہم اصول سے اپنی بات شروع کرتے ہیں۔ دیکھیے! لوگوں پر دینی ذمے داریاں واضح کرتے ہوئے انھیں یہ بتانا کہ یہ کام تم پر فرض یا واجب ہے گویا ان کو یہ بتانا ہے کہ تم سے تمھارے رب کا تقاضا یہ ہے اور تمھارا خدا تم سے یہ چاہتا ہے۔ یہ گویا اللہ کی نمائندگی یا اللہ سے روایت کرنا ہے۔ انبیا علیہم السلام تو وحی کی روشنی میں یقین سے یہ کہا کرتے تھے لیکن آج عالم یا خادمِ دین کس بنیاد پر لوگوں سے یہ کہہ سکتا ہے کہ تمھارا رب تم سے کیا کام کرانا چاہتا ہے۔ اس کا ایک آسان جواب یہ ہے کہ ہم قرآن کی بنیاد پر یہ سب کچھ کہیں گے اور حدیث میں آیا ہے کہ ﴿مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ﴾ ”جس نے قرآن سے کوئی بات کہی تو اس نے سچ کہا“۔ لیکن اس قولِ نبی ﷺ کا معنی کیا ہے؟ علماء اس کی شرح کیسے کرتے ہیں: مَنْ قَالَ قَوْلًا مُلْتَبِسًا بِهِ بِأَنْ يَكُونَ عَلَى قَوَاعِدِهِ وَوَفْقَ قَوَانِينِهِ وَضَوَابِطِهِ صَدَقَ (مرقاۃ المفاتیح) ”جس نے قرآن کے ذریعے کوئی بات، اس کے قواعد و ضوابط اور قوانین (فہم و تفسیر) کے مطابق کہی تو اس نے سچ کہا“۔ تو کسی کے پاس قرآن و سنت کی کوئی دلیل ہونا کافی نہیں ہے بلکہ فیصلہ کن امر یہ ہے علمی و اصولی طور پر اس دلیل سے استدلال کس کا درست ہے ورنہ بلا تشبیہ سوچیں کہ خوارج کے پاس بھی دلیل تو قرآن ہی کی تھی۔ اسی طرح ماضی قریب کے دونوں غلامی فتنے، یعنی غلام احمد قادیانی اور غلام احمد پرویز

قرآن ہی کے تو داعی تھے !!

علمِ دین کی روایت

تو کیا ''ڈگری ڈگری ہوتی ہے...'' کی طرح ہم یہ مان لیں کہ تعبیر تعبیر ہوتی چاہے اصلی ہو یا نقلی ؟ اگر نہیں تو سوال یہ ہے کہ صحیح اور غلط تعبیر میں فرق کا معیار کیا ہے ؟ تو اس کے معیار کے طور پر علمِ دین کی وہ پوری روایت اپنے اصول وضوابط کے ساتھ کھڑی ہے جس کی خبر حدیثِ مرفوع میں بیان ہوئی ہے: ﴿لَا يَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَهُمْ أَمْرُ اللهِ وَهُمْ عَلَى ذَلِكَ﴾ (صحیح بخاری) ''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے امر پر قائم رہے گا ان کو چھوڑنے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے ان کا نقصان نہ کر سکیں گے یہاں تک کہ اللہ کا حکم (فیصلۂ قیامت) آ جائے اور وہ اسی حال پر رہوں گے''۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے الاعتصام بالکتاب میں لکھا ہے: وَهُمْ أَهْلُ الْعِلْمِ ''وہ اہلِ علم کی جماعت ہے''۔

اسی علمی روایت کے ذریعے قیامت تک آنے والے انسانوں کو پورے یقین کے ساتھ یہ بتایا جاسکتا ہے کہ اُن کا معبود اُن سے کیا چاہتا ہے۔ بدلتے حالات میں بدلتے احکامات اور ان احکام میں ہر انسان کے لیے مخصوص کردار کا تعین اسی علمی روایت کے ذریعے درست طور پر ممکن ہے۔

روایتِ علمی کے شعبے اور سنت کی تعریف

دین کی علمی روایت کے مختلف شعبے ہیں۔ مشہور محدث امام اعمش رحمہ اللہ نے کسی فقیہ سے خطاب میں علمی روایت کے دو شعبوں کی طرف اشارہ کیا ہے: يَا مَعْشَرَ الْفُقَهَاءِ أَنْتُمُ الْأَطِبَّاءُ وَنَحْنُ الصَّيَادِلَةُ ''اے جماعتِ فقہاء! طبیب تم ہو، ہم تو پنساری ہیں''۔ تو محدث کا بنیادی کام، احادیث و آثار کی جمع و ترتیب ہے اور فقہاء کا بنیادی کام ان نصوص کے معانی کی تشریح اور ان سے استنباط کر کے احکام اخذ کر کے ان کی درجہ بندی قائم کرنا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض محدثین کو اللہ نے فقاہت سے بھی نوازا ہوتا ہے لیکن انھوں نے خود کو فقہاء کی فقاہت سے بے نیاز نہیں سمجھا بلکہ انہی کے ایک سرخیل امام ترمذی رحمہ اللہ نے فقہاء کا نام لے کر فرمایا: هُمْ أَعْلَمُ بِمَعَانِي الْحَدِيثِ (سنن ترمذی) ''وہ حدیث کے معانی کے زیادہ

جاننے والے تھے''۔ تو محدثین نے نصوصِ سنت و سیرت کو جمع کیا لیکن اس سے احکامات کی ترتیب دینا فقہاء کا کام ہے۔ پھر فقہاء میں سے ماہرینِ اصولِ دین، اصولیین ہیں جنھوں نے استنباط و اجتہاد کے اصول ترتیب دیے ہیں۔ اس لیے دین کی تفہیم و تشریح میں اصولیین کے کام کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

ہماری بحث چونکہ سنت و سیرت کے گرد گھومتی ہے اس لیے ان کی تعریفات کو ذہن میں تازہ کر لیتے ہیں۔ محدثین کے ہاں حدیث و سنت کی تعریف یوں کی جاتی ہے: مَا أُضِيفَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَوْلًا لَهُ أَوْ فِعْلًا أَوْ تَقْرِيرًا أَوْ صِفَةً ''ہر وہ چیز جس کی نسبت نبی اکرم ﷺ کی طرف کی جائے چاہے قول میں سے ہو یا فعل و تقریر میں سے یا کسی صفت کا بیان ہو''۔ اس کی تفصیل میں جائیں تو شمائل اور نبی ﷺ کے حالاتِ زندگی کا بیان بھی، محدثین کے ہاں سنت میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ اب سیرت کی طرف آتے ہیں تو سیرت کی عام طور پر کی گئی تعریف حدیث کی تعریف سے ملتی جلتی ہے البتہ یہ کہ اس میں زمانی ترتیب کی قید لگائی جاتی ہے یعنی نبی ﷺ کے حالات و وقائع اور حوادثِ زندگی کا بیان، پیدائش سے لے کر انتقال تک، زمانی ترتیب کے مطابق، اس میں تدبیری اور بشری امور بھی شامل ہیں۔

علمائے اصول کے ہاں سنت کی تعریف یوں کی جاتی ہے: مَا صَدَرَ عَنِ الرَّسُولِ مِنَ الْأَدِلَّةِ الشَّرْعِيَّةِ مِمَّا لَيْسَ بِمَتْلُوٍّ، وَلَا هُوَ مُعْجِزٌ وَلَا دَاخِلٌ فِي الْمُعْجِزِ، وَهَذَا النَّوْعُ هُوَ الْمَقْصُودُ بِالْبَيَانِ هَاهُنَا، وَيَدْخُلُ فِي ذَلِكَ أَقْوَالُ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَأَفْعَالُهُ وَتَقَارِيرُهُ (الأحكام في أصول) ''جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے صادر ہوا، دلائلِ شرعیہ میں سے، جو متلو نہیں ہے اور وہ نہ تو معجزہ ہے اور نہ معجزے میں داخل ہے۔ ہمارے ہاں اسی قسم کا بیان مقصود ہے اور اس میں اقوالِ نبی ﷺ اور آپ کے افعال و تقاریر شامل ہیں''۔ تو دیکھیے کہ اصولیین نے سنت کی تعریف میں سیرت کو داخل نہیں کیا بلکہ ان افعال و اقوال و تقاریر کو سنت کی تعریف میں داخل کیا جو شرعی دلائل بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس بات کو دوسرے انداز میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ سیرت عام ہے اور سنت خاص ہے یعنی جو کچھ آپ ﷺ سے صادر ہوا، وہ سیرت ہے لیکن سیرت کا ہر واقعہ سنت نہیں ہے بلکہ وہ واقعات و اقدامات جو دلیلِ شرعی بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں؛ وہی سنت کی

تعریف پر پورے اترتے ہیں۔

اب آپ ﷺ کے افعال میں سے کون سے دلیلِ شرعی بن سکتے ہیں۔ علامہ آمدی رحمہ اللہ نے اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ مثلا: نبی کریم ﷺ نے خود اپنے کسی فعل یا امر کے لزوم کا حکم دیا ہو۔ جیسے نماز میں ہو بہو آپ ﷺ کی پیروی کرنے کی دلیل ﴿صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي﴾ ہے اور حج کے بارے فرمانِ اقدس ﴿خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ﴾ آپ ﷺ کی پیروی کو لازم کرتا ہے۔ بعض اوقات آپ ﷺ کا فعل کسی مجمل حکم کی تفصیل یا کسی مطلق کی تقیید پر مبنی ہوتا ہے، تو یہ افعال بھی دلیلِ شرعی میں شامل ہیں۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق کوئی حکم موجود نہیں ہوتا لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ آپ ﷺ کا اس کام کو کسی خاص انداز سے کرنا قربِ الٰہی کے ارادے سے تھا۔ تو بعض کے نزدیک یہ کام مباح ہے اور بعض کے نزدیک یہ مستحب ہے۔ رہے وہ کام جو مندرجہ بالا کسی صورت پر پورے نہ اترتے ہوں ان کے بارے میں درست بات یہی ہے کہ یہ کام مستحب و واجب نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ مباح ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات سامنے آئی کہ نہ تو نبی کریم ﷺ کا ہر فعل سنت میں داخل ہے اور نہ ہی ہر فعل تشریع کا عنوان ہے۔ اس لیے بغیر تجزیے کے سیرت کے ہر واقعے اور مرحلے کو دلیلِ شرعی کے طور پر قبول کر لینا اصولِ شریعت کے خلاف ہونے کے سبب نامناسب ہے۔ سیرت کے جو واقعات سنت میں داخل ہو جائیں ان پر عمل کرنے کے بھی کچھ آداب و اصول متعیّن ہیں۔ مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی سنت کے بارے میں بحث حجة الله البالغة کے المبحث السابع: أقسام علوم النبي ﷺ کے ذیل میں پڑھنی چاہیے، لکھتے ہیں: ”سنت کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جس میں آپ ﷺ نے اللہ کے احکام کو بندوں کے لیے قولی یا عملی طور پر واضح کیا۔ اسی کے بارے میں فرمایا گیا کہ ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ ”اور تمھیں جو کچھ رسول دیں لے لو، اور جس سے روکیں رک جاؤ“۔ سنت کی اس قسم میں معاد، ملکوت اور غیب کی خبریں، عبادات و ارتفاقات (آدابِ زندگی) سے متعلق وضاحتیں، عام مصلحتیں اور مطلق اخلاقیات اور فضائلِ اعمال کے بیان شامل ہیں۔ ان تمام کا دار و مدار وحی پر ہے اور بعض میں آپ ﷺ کا اجتہاد بھی داخل ہے مگر وہ بھی اللہ کے سکھائے ہوئے خاص اصولوں پر مبنی ہے اور اللہ کی حفاظت میں ہے۔ دوسری قسم وہ ہے کہ جو تبلیغ

الرسالۃ سے تعلق نہیں رکھتی، جس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِينِكُمْ فَخُذُوا بِهِ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيٍ فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ﴾ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں ایک بشر ہی تو ہوں، جب میں تمھیں دین کی کسی بات کا حکم دوں تو اسے مضبوطی سے پکڑلو اور جب میں تمھیں محض اپنی رائے سے کچھ کرنے کو کہوں تو میں بشر ہی تو ہوں'' اور ﴿فَإِنِّي إِنَّمَا ظَنَنْتُ ظَنًّا، فَلَا تُؤَاخِذُونِي بِالظَّنِّ، وَلَكِنْ إِذَا حَدَّثْتُكُمْ عَنِ اللهِ شَيْئًا، فَخُذُوا بِهِ، فَإِنِّي لَنْ أَكْذِبَ عَلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ﴾ '' آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تو ایک بات کا گمان کیا تھا، تو گمان کے حوالے سے مجھے ذمے دار نہ ٹھہراؤ، لیکن جب میں اللہ کی طرف سے تمھارے ساتھ بات کروں تو اسے اپنالو، کیونکہ میں اللہ عزوجل پر کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا''۔

سنت کی اس قسم میں طب، تجربہ، عادات، مروجہ باتیں جو سب لوگ ہی کیا کرتے تھے (جیسے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مطابق جب ہم لوگ دنیا یا کھانے پینے کے بارے میں گفتگو کرتے تو حضور ﷺ بھی ہمارے ساتھ انہی موضوعات پر گفتگو فرماتے)۔ بعض اوقات آپ ﷺ نے کسی جزئی مصلحت اور ہنگامی ضرورت کے حصول کے لیے کچھ کام کیے، وہ بھی تمام امت کے لیے لازمی نہیں ہیں۔ ان کی مثال یوں ہے جیسے کوئی بادشاہ فوجوں کو احکام دیتا ہے اور شعار مقرر کرتا ہے۔ اسی طرح وقتی تدابیر اور خاص مقدمات کے فیصلے وغیرہ بھی اسی قسم میں شامل ہیں۔

سنت کی یہ دوسری قسم چونکہ وحی نہیں ہے اور نہ ہی یہ وحی کے اصولوں پر مبنی نبی کریم ﷺ کا اجتہاد ہے، اس لیے یہ مِن وعن اور بعینہ واجب الاطاعت نہیں بلکہ مختلف زمان و مکان میں درپیش مختلف حالات میں مختلف عمل درکار ہوگا۔ تجربہ بھی وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے، اسی طرح عادات و اطوار اور ثقافتی رکھ رکھاؤ بھی ہر جگہ مختلف ہوتی ہیں۔ اس کی رعایت فقہِ اسلامی میں عرف کے عنوان سے کی جاتی ہے۔ یہی صورت تدابیر اور فیصلوں کی بھی ہے کہ حالات کی نزاکت کے مطابق حکمتِ عملی اسی مناسبت سے تیار کی جاتی ہے، یہ وہ قسم ہے کہ اس پر عمل نہ کرنے سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ چونکہ اقامتِ دین یا انقلاب کا تعلق تشریع سے نہیں بلکہ تدبیر سے ہے اس لیے یہاں بھی آپ ﷺ کے طرزِ عمل کی پیروی کرنا لازمی یا واجب نہیں ہے۔

اگلے باب میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ سنت کی ایک اور طرح کی تقسیم بیان فرماتے ہیں: بعض سُنن، مصالح

کے متعلق ہیں اور بعض شرائع کے مطابق۔ مصالح وہ علوم ہیں جن میں لوگوں کے زیست سے متعلق نفع و مضرت کی ہدایات دی گئی ہیں۔ یعنی دین میں امور مفیدہ یا بعض مصالح کی تعریف و ترغیب اس طور وارد ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مصلحت کو پورا کرنا چاہیے جیسے شجاعت اور نرم دلی کا بیان۔ اسی طرح بعض نقصان دہ امور یعنی مضرتوں کی مذمت اس طور وارد ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بچنا چاہیے جیسے بزدلی اور سخت دلی وغیرہ کا بیان۔ دین نے ان مصلحتوں کو پورا کرنے کے لیے مخصوص و محسوس صورتیں اور ہیئتیں نہیں سکھائیں کہ جن کو بجالانے کا انسانوں سے تقاضا ہوتا ہو اور ان ظاہری صورتوں کے پورا کرنے پر ان مصلحتوں کے حصول کو یقینی اور ان حکمتوں کو مکمل سمجھا جاتا اس طرح یہ ظاہری محسوس صورتیں مدارِ حکم کہلاتیں بلکہ اس کے برعکس ہوا کہ اللہ نے ان مصلحتوں کا انسانوں سے تقاضا کیا اور ان حکمتوں کو اصل مطلوب قرار دے کر انھیں حاصل کرنے کی تاکید کی اور ان مصلحتوں کو مدارِ حکم قرار دیا لیکن ان کو بجالانے کی عملی صورت انسان کی صوابدید پر چھوڑ دی۔ اس قسم کے احکام کو مصالح کی اصطلاح سے متعارف کرایا گیا ہے مصالح سے متعلق علوم سنت، زندگی کے تین شعبوں سے متعلق ہیں: تہذیبِ نفس، اعلاے کلمۃ اللہ یا نفاذِ دین کی کوشش اور لوگوں کے معاملات و رسوم کا انتظام۔ یعنی شارع نے ہم سے تہذیبِ نفس کا تقاضا تو کیا ہے لیکن اس کی کسی خاص شکل کا ہم سے مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اسی طرح نفاذِ دین، اعلاے کلمۃ اللہ یا لوگوں کی بہتری کا ہم سے تقاضا تو کیا گیا ہے لیکن اس کے لیے کوئی مخصوص طریقہ اور پیکر و صورتِ عمل کا ہم سے مطالبہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ ہماری صوابدید پر چھوڑا گیا کہ وقت کی مناسبت سے کوئی سا طریقہ اختیار کر لیا جائے بشرطیکہ وہ شریعت کے دائرے سے باہر نہ ہو۔ مصالح کے بارے میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ باتیں عقلی ہیں اور انسان انھیں بعثتِ انبیا سے پہلے بھی جانتے تھے، اللہ نے محض اپنا فضل فرمایا کہ انبیا کے ذریعے عمدہ طریقے سے یاد دہانی فرما دی۔

احکام کی دوسری قسم کو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے شرائع کا نام دیا ہے۔ جس میں حدود اور عبادات وغیرہ شامل ہیں۔ احکام کی اس قسم میں حکمت ہوتی تو ہے لیکن وہ عقلی نہیں ہوتی یعنی غور و فکر سے ان احکام کی حکمتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ لہذا حدود و فرائض اور عبادات کی حکمتیں معلوم بھی نہیں ہو پاتیں، بعض دفعہ اگر حکمت معلوم بھی ہو جائے تو وہ

علت یعنی مدارِ حکم نہیں بن پاتی۔ اس لیے کہ حکمت کوئی امر منضبط نہیں ہے جو کسی ناپ تول میں آ سکے۔ شارع نے شرائع کے ضمن میں بعض محسوس و مخصوص پیکر اعمال مقرر فرما دیے اور ان اعمال کی بجا آوری کا انسان سے تقاضا کیا گیا۔ ان احکام کی حکمتیں بتائی نہیں گئیں بلکہ ان احکام کو حکمتوں کا مظنہ قرار دیا گیا یعنی جو آدمی ان مخصوص اعمال کو ان کے آداب کے ساتھ ادا کرے گا تو اسے وہ حکمت حاصل ہوتی جائے گی جو اس عمل سے جڑی ہوئی تھی۔ تو شرائع میں شارع نے ہم سے کسی حکمت کو پورا کرنے کا تقاضا نہیں کیا بلکہ اس فعل کو بجالانے کا تقاضا کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی حکمت کا مظنہ ہے۔ تو مصالح میں اصل مطلوب حکمت ہے اور شرائع میں اصل مطلوب فعل ہے جس کو بجالانا ہے۔

اگر ہم نماز کی مثال لیں جس کا تعلق شرائع سے ہے، اگر یہ کہا جائے کہ نماز کی حکمت اور مطلوب اللہ کا ذکر اور یاد ہے، تو اگر ایک آدمی کہے اللہ کی یاد میرے دل میں راسخ ہو چکی ہے اس لیے مجھے مزید نمازیں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے یا میں ایک اذان سے دوسری اذان تک، بیٹھ کر اللہ کی یاد کو قائم کروں گا لیکن میں نماز نہیں پڑھوں گا۔ تو چاہے اللہ کی یاد وہ قائم کیے رکھے لیکن وہ اس نماز کا عمل سرانجام نہ دے جو تکبیر سے شروع ہو اور قیام و رکوع و سجود کے بعد سلام پر ختم ہو، تو اس کا اللہ کی یاد قائم کر لینا اسے ترکِ نماز کے گناہ سے محفوظ نہ رکھے گا، اس لیے کہ نماز میں اصل مطلوب اللہ کی یاد نہیں بلکہ نماز کا مخصوص فعل ہے اور اس کی پابندی کرنا ہمارے لیے لازمی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم یہ کہیں کہ سود اس لیے حرام ہے کہ اس سے لوگوں پر ظلم ہوتا ہے اور ظلم کی بیخ کنی، حرمتِ سود کی حکمت ہے لیکن چونکہ ممانعت سود کا تعلق مصالح سے نہیں بلکہ شرائع سے ہے اس لیے اگر سود کی کوئی ایسی قسم پائی جائے جس میں ظلم نہ ہو، سود تب بھی حرام ہی رہے گا۔ مثلاً اگر ایک آدمی سود پر دوسرے سے قرض لے لے اور اس کی جگہ پر سود کوئی تیسرا شخص، صدقے کی نیت سے ادا کر دے تب بھی یہ معاملہ کرنا حرام ہی رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ مصالح میں اصل مطلوب، مصلحت و حکمت ہوتی ہے اسے پورا کرنا لازمی ہوتا ہے اور اس کے لیے کسی خاص طرز کے اعمال و افعال کی پابندی کرنا لازمی نہیں ہوتا بلکہ حکمتِ مطلوبہ کو پورا کرنے والے کسی بھی عمل کو اختیار کیا جا سکتا ہے اور اس اختیار میں انسان کو آزادی دی گئی ہے کہ کوئی خاص فعل شارع کی طرف سے لازم نہیں کیا گیا۔

شرائع کی قسم سے تعلق رکھنے والے احکام کی ہیئت مخصوص ہے جس کو شارع نے انسانوں کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ ان ظاہری خاص طرح کے اعمال کو انجام دینے ہی کا ہم سے تقاضا ہوتا ہے۔ ہم اس ظاہری عمل کو چھوڑ نہیں سکتے چاہے حکمت پوری ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو اور نہ ہی ہم اپنے تئیں اس ظاہری فعل کے علاوہ کسی دوسرے فعل کو زیادہ فائدہ مند سمجھ کر اختیار کر سکتے ہیں بلکہ ہر حال میں ہمارے لیے اس فعل ہی کی پابندی ضروری ہے۔

مندرجہ بالا بحث اگر سمجھ لی گئی تو اب اپنی توجہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ان الفاظ پر مرکوز کیجیے:

"کلمہ حق کو بلند کرنا، شریعت کا استحکام اور اس کی اشاعت میں محنت کرنا یہ بھی مصالح کے باب سے متعلق ہے"۔

اب انقلاب یا اعلاے کلمۃ اللہ جو مصالح میں سے ہے تو اس میں کسی خاص طرح کے اعمال بجالانا یا خاص ترتیب و نہج کی پابندی کرنا لازم نہیں ہے۔ بلکہ ہر دور میں حالات کے پیشِ نظر مختلف حکمتِ عملی ترتیب دی جائے گی۔ اور چونکہ اس کا تعلق مصالح سے ہے، اس لیے اس کی کوئی ہیئتِ مخصوصہ مقرر نہیں ہے بلکہ صرف مصلحت مقصود ہے اور امت اس باب میں حالات و واقعات کی مناسبت سے فیصلہ کرے گی۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ کسی غیر مسنون کام کی مرتکب بھی نہیں ہو گی بلکہ مصلحت کے لیے اس وقت کی درست حکمتِ عملی پر عمل کرنا ہی سنت کا اصل تقاضا ہو گا۔ البتہ اس میں قید اتنی ہی ہے کہ آپ کا طے کردہ طریقہ کسی نص کے خلاف نہ ہو، مطلب یہ کہ منہج کا سنت کے مطابق ہونا ضروری نہیں بلکہ اتنا ہی ضروری ہے کہ سنتِ ثابتہ کے خلاف نہ ہو۔

دوسرا مسئلہ معروضی (objective) مطالعے کا ہے۔ معروضی مطالعے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی مابعد الطبعیات اور عقائد سے بلند ہو کر محض ایک سماجی واقعے/ظاہرے (social phenomenon) کی حیثیت سے انقلابِ نبوی ﷺ کا مطالعہ کر کے طریقۂ انقلاب اس طرح بیان کیا جائے کہ یہ طریقہ غیر اقداری بنیادوں پر وضع ہو اور جہاں بھی اسے ڈھالا جائے یہ ایک ہی جیسے نتائج منتج کرے۔ اس کے نتیجے میں اظہارِ دینِ حق محض ایک سیاسی، سماجی و معاشی نظام کی تبدیلی کا نام رہ جاتا ہے۔ اب اسی معروضیت کا شاخسانہ ہے کہ "منہجِ انقلابِ نبوی" کے نام سے جو منہج تراشا گیا وہ خود ہی جدید تحریکوں سے متاثر نکلا۔ انتخابات کو یہ کہا جائے کہ وہ تو مغرب نے دیا ہے لیکن احتجاج کو اجتہاد کے نام پر قبول کیا جائے تو ہمارے خیال میں یہ

جانے انجانے میں مغرب ہی سے متاثر ہونا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ "منہجِ انقلابِ نبوی" علومِ نبوی کے کسی ماہر کو، کسی محدث، کسی حافظ الحدیث، کسی شارح و امام، کسی سیرت نگار کو سمجھ نہیں آتا؟ اگر کوئی یہ کہے کہ ان لوگوں کے دور میں چونکہ انقلاب کی اس درجے ضرورت نہ تھی تو کیا خیال ہے ان فقہاء کے بارے میں... جنھوں نے فقہ تقدیری بناڈالی، اگر یہ منہج واقعی کوئی " مخصوص درجات" کے ساتھ متعیّن امرِ شرعی ہوتا، تو وہ چند باتیں منہجِ تقدیری پر کرنے سے کیونکر چوکتے۔ چنانچہ ہمارے خیال میں منہجِ انقلابِ نبوی اصل میں تاثر ہے جدید "انقلاباتی" تحریکوں کا اور اس تاثر کے تحت سیرت کا جو مطالعہ کیا گیا وہ مطالعہ اسی تاثر کو ثابت کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

اب آتے ہیں سیرتِ نبوی سے منہج انقلاب کی تشکیل کے دوسرے اصول "خاص کو عام" (generalize) کرنے کی طرف، تو اس کا کُھرا بھی جدیدیت ہی کی طرف نکلتا ہے۔ عمرانیات کے بانی August Comte کے مطابق اب دور ہے سائنس کا، جس کو وہ Positivism کہتا ہے۔ اب ہر بات سائنس کی ٹھوس بنیادوں پر قائم کی جائے گی اور دنیاوی حوادث کے بیانیے میں کسی مافوق الفطرت نظریے کا کوئی دخل نہیں ہو گا۔

اب جب ہر چیز کا سائنسی وعقلی ہونا ہی درست ٹھہرا تو مذہب ایک صحت مند سماجی عمل ٹھہرا۔ اب تعمیم کے اصول (generalizability) کے تحت سیرت النبی ﷺ اور اس کے واقعات کو انسانی سطح پر لاکر سمجھنے کی کوشش کی جانے لگی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو "نوعِ انسانی کا عظیم ترین انقلابی" قرار دے کر شکوہ کیا گیا کہ آپ جیسے انقلابی کے گرد ہم نے تقدس و احترام کا ہالہ بنا دیا ہے۔ کہا گیا کہ منہج میں معجزوں کا دخل بہت کم نظر آتا ہے، آپ زخمی تک ہوئے لیکن نہ دشمنوں کے ہاتھ شل ہوئے اور نہ وہ زمین میں دھنسائے گئے۔

ٹھیک ہے طائف میں ان کے ہاتھ شل نہ ہوئے لیکن مَلَکُ الجِبال تو آ ہی چکا تھا اسے واپس کس نے لوٹایا۔ اہل طائف زمین میں نہ دھنسے تو اللہ کی مرضی اور حکمت تھی، لیکن سراقہ بن مالک کے گھوڑے کو کیا ہوا تھا؟ کہا گیا کہ انقلابی جدوجہد میں معجزات کا حصہ کتنا تھا سوچیں تو سہی؟ ہم سوچے بغیر بتا دیتے ہیں کہ یوم الفرقان جنگِ بدر کی فتح خرقِ عادت ہی تو تھی کہ جبریلِ امین خود میدان میں موجود، صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم تلوار سیدھی کر رہے ہوتے اور ہمارا دشمن دو

ٹکڑے ہو جاتا۔ ایک بڑی فتح غزوۂ خندق تھی جس کے بارے میں خود اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے وہ لشکر بھیجے جو تم نے دیکھے ہی نہیں۔ آپ کافروں کے گھیرے میں سے، ان کی آنکھوں کے سامنے، نظر آئے بغیر نکل گئے۔ اور وہ جو تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کی کمک تھی وہ کس انسانی سطح کی مدد تھی؟ کھجور کی شاخ صحابی کے ہاتھ میں تلوار بن جاتی ہے۔ مٹی کی ایک مٹھی پوری کافر فوج کی آنکھوں میں جا پڑتی ہے!! یہ تو موٹے موٹے اشارے کر دیے ہم نے، ورنہ جہادی اسفار و معرکوں میں ہونے والے خرق عادت واقعات بہت سارے ہیں کوئی ایک نہیں۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کی تو پوری سیرت ہی معجزہ تھی۔

علامہ عبد الرحمٰن محمد ابن خلدون، مقدمۂ تاریخِ ابنِ خلدون کے تیسرے باب کی انچاسویں فصل في أن الدولة المستجدة إنما تستولي على الدولة المستقرة بالمطاولة لا بالمناجزة میں سلطنت کے قیام کی تدریج بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: ولا يعارض ذلك بما وقع في الفتوحات الإسلاميّة وكيف كان استيلاؤهم على فارس والرّوم لثلاث أو أربع من وفاة النّبيّ ﷺ واعلم أنّ ذلك إنّما كان معجزة من معجزات نبيّنا --- فكان ذلك كلّه خارقا للعادة المقرّرة في مطاولة الدّول المستجدّة للمستقرّة وإذا كان ذلك خارقا فهو من معجزات نبيّنا صلوات الله عليه المتعارف ظهورها في الملّة الإسلاميّة والمعجزات لا يقاس عليها الأمور العاديّة۔"(دورِ نبوت واصحاب کی) فتوحاتِ اسلام ہمارے مذکورہ بالا اصولِ تدریج سے معارض نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے فارس و روم جیسی عظیم الشان سلطنتوں کو بہت جلد فتح کر لیا۔ ابھی انحضرت ﷺ کی وفات کو چار ہی برس گزرے تھے کہ ان دونوں سلطنتوں کا شیرازۂ جمعیت بکھر گیا اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں آگئی۔ مگر یہ سب کچھ ہمارے نبی ﷺ کا ایک معجزہ تھا... اس وقت جو کچھ بھی ہوا وہ بالکل معجزہ اور خرقِ عادت تھا اور واقعاتِ اعجاز و خرقِ عادت، طبعی امور پر قیاس نہیں کیے جا سکتے"۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ کا انقلاب خرقِ عادت امور سے لیس تھا اور اس انقلاب کو عیناً عام حالات میں عام لوگوں کے لیے منہج بنانا ممکن نہیں۔ معجزات کو عام زندگی کے لیے طبعی اصول بنا کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس موقع پر اصولیین کی تعریفِ سنت کو ذہن میں رکھنا چاہیے جس میں وہ شرط لگاتے ہیں کہ سنت وہ ہے جو معجزہ

نہیں ہے۔

علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''دورِ حاضر کے فتنے اور ان کا علاج'' میں ایک باب '' فتنۂ مغربیت'' کا باندھا ہے اور اس کا استدلال اس حدیث سے کیا ہے: ﴿عَنْ عِصْمَةَ بْنِ قَيْسٍ السُّلَمِيّ صَاحِبِ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم، عَنِ النَّبِيّ صلى الله عليه وسلم، أَنَّهُ كَانَ يَتَعَوَّذُ بِاللهِ مِنْ فِتْنَةِ الْمَشْرِقِ، قِيلَ لَهُ: فَكَيْفَ فِتْنَةُ الْمَغْرِبِ قَالَ: تِلْكَ أَعْظَمُ وَ أَعْظَمُ﴾ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عصمہ بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتنۂ مشرق سے پناہ مانگا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا مغرب میں بھی فتنہ ہو گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تو بہت ہی بڑا ہے، سب سے بڑا ہے! علامہ بنوری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے مغرب کے علمی فتنے پر استدلال کیا ہے جس نے عالمِ اسلام میں الحاد و تحریف کی لہر پیدا کر دی۔ انھوں نے مزید یہ بھی فرمایا ہے کہ ہمارے ملک میں آنے والے وقتوں میں جدید تعلیم، مواصلات کی آسانیوں اور دولت کی فراوانی سے فتنۂ مغرب میں اضافہ ہو گا۔ مسنون الفاظ میں اللہ سے دعا ہے کہ أعوذ بالله من فتنة المغرب میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں فتنۂ مغرب سے، آمین!

*****

مولانا حماد احمد ترک
نائب مدیر، ماہنامہ مفاہیم، کراچی

نعت گوئی اور چند اردو نعت گو شعرا

خدا کے گھر کا رستہ مصطفیٰ کے گھر سے جاتا ہے
وہاں سے جاؤ گے تو کوئی پیچ و خم نہیں ہوں گے

"وہ نظم، جو ختمی مرتبت ﷺ کی مدحت سے وابستہ ہوتی ہے، نعت کہلاتی ہے، نعت کی کوئی خاص ہیئت تجویز نہیں کی گئی ہے"۔(شعریات از نصیر ترابی) اردو میں نعت عربی اور فارسی سے آئی، بعض شعرا نے باقاعدہ نعت لکھی، بعض نے غزل میں نعت کے ایک دو شعر نظم کیے اور مثنوی کی ابتدا میں بھی حمد و نعت اردو شعرا کا وتیرہ رہا۔

نعت کی ابتدا تو سابقہ انبیا کے مبارک صحیفوں میں میرے آقا ﷺ کی آمد کی اَخبار اور آپ ﷺ کے اوصاف کے بیان سے ہو چکی تھی لیکن اسے عروج؛ قرآنِ مجید میں حاصل ہوا۔ چنانچہ کہیں ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ تو کہیں ﴿عَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ کہا گیا۔ کہیں ﴿مَا وَدَّعَكَ﴾ اور ﴿مَا قَلٰى﴾ سے دل جوئی کی گئی، تو کہیں ﴿اَنْتَ فِيْهِمْ﴾ سے آپ ﷺ کی عظمت اجاگر کی گئی۔ کبھی ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ﴾ پڑھا تو آپ ﷺ کی قدر و منزلت آنکھوں کے راستے درونِ قلب تک جا پہنچی اور کبھی ﴿لَا تَرْفَعُوْا﴾ سنتے ہی تمام تر اجساد خاکی آپ ﷺ کی تعظیم میں جھکتے چلے گئے۔ کہیں تو شارع نے دو ٹوک الفاظ میں ﴿وَمَا اٰتَاكُمُ﴾ سے آپ ﷺ کے اقوال و افعال کی حجیت کا اعلان کیا اور جب کبھی اپنی شانِ رحمت کے اظہار کے لیے نطق فرمایا تو آپ ﷺ رحمۃ للعلمین قرار پائے، اگر کہیں ﴿اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ﴾ سے عبدیت اور بشریت کی طرف اشارہ ہوا تو ﴿قَابَ قَوْسَيْنِ﴾ کے ذکر سے اپنے

بندے کو رفعتوں اور قربتوں کی معراج پر پہنچا دیا۔ صلی اللہ علی محمد!

عبد دیگر عبدہ چیزے دگر　　　ایں سراپا انتظار او منتظر

اور

لیکن رضاؔ نے ختمِ سخن اس پہ کر دیا　　　خالق کا بندہ خلق کا آقا کہوں تجھے

اور

مدحت اس کی کیوں نہ کریں، وہ مدحت کا حقدار بھی ہے　　　بعدِ خدا جو اپنی حدوں میں، مالک بھی مختار بھی ہے

پھر نعت گوئی کے اس پاکیزہ سلسلے کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے آگے بڑھایا تو ان میں سے ایک جماعت اس نیک کام میں جُت گئی، کفار کی یورش کے سبب اُس وقت نعت میں مدافعت کا رنگ غالب تھا۔ علامہ ابن سیرین رحمہ اللہ کے قول کے مطابق سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اپنے شعر کے ذریعے کافروں کو جنگ کے خوفناک انجام سے ڈراتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ انھیں ان کے کفر پر عار دلاتے اور سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ ان کے نسب پر (اعتراض کر کے انھیں) چوٹ پہنچاتے (أسد الغابة لابن الأثير، ۴/۴۶۱)۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کافروں کی ہجو کا جواب دینی ضرورت اور فریضہ سمجھ کر دیتے اور اس خدمت پر اللہ ہی سے اجر کے طالب ہوتے۔ چنانچہ سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَأَجَبْتُ عَنْهُ　　　وَعِنْدَ اللهِ فِيْ ذَاكَ الْجَزَآء

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا بَرًّا تَقِيًّا　　　رَسُوْلَ اللهِ شِمْحَتُهُ الْوَفَآء

فَإِنَّ أَبِيْ وَوَالِدَتِيْ وَعِرْضِيْ　　　لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْكُمْ وِقَآء

ترجمہ: تو نے محمد ﷺ کی برائی بیان کی میں نے اس کا جواب دیا اور اس کا بدلہ اللہ کے پاس ہے۔ تو نے محمد ﷺ کی برائی بیان کی جو نیک اور متقی ہیں (وہ) اللہ کے رسول ہیں، ایفاے عہد آپ کی عادت و فطرت ہے۔ میرے والدین اور میری آبرو محمدی وقار کے تحفظ کے لیے قربان ہے۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ دورِ اول میں نعت شریف صرف مدافعت تک محدود تھی بلکہ مدحت میں بھی ان مبارک ہستیوں نے جولانیاں دکھائیں۔ سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم ہی کے شعر دیکھ لیجیے:

وَأَحسَنَ مِنكَ لَم تَرَ قَطُّ عَيني وَأَجمَلَ مِنكَ لَم تَلِدِ النِساءُ

خُلِقتَ مُبَرَّأً مِن كُلِّ عَيبٍ كَأَنَّكَ قَد خُلِقتَ كَما تَشاءُ

ترجمہ: آپ ﷺ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے ہرگز نہیں دیکھا اور آپ ﷺ سے زیادہ جمیل کسی عورت نے جنا ہی نہیں۔ آپ ﷺ ہر عیب سے پاک وصاف پیدا کیے گئے، گویا کہ آپ ﷺ اس طرح پیدا کیے گئے جیسا کہ آپ ﷺ نے چاہا۔

انھیں یہ بھی احساس رہتا کہ ان کی ثنا خوانی، آقاے دوجہاں کی شان میں اضافہ نہیں کرتی بلکہ آپ کی ثنا و نعت سے خود ہماری ہی شان بلند ہوتی ہے:

ما إنْ مَدَحْتُ مُحَمدا بمقالتي لكن مدحت مقالتي بمحمد

ترجمہ: یوں نہیں ہے کہ میں نے اپنے کلام کے ذریعے محمد ﷺ کی مدح کی، بات تو یوں ہے کہ آپ ﷺ کی مدح سے میں نے اپنا کلام معطر کر لیا۔ پھر عہدِ تابعین سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، اور تا قیامِ قیامت بلکہ دوسرے جہان میں بھی نعتِ رسول ﷺ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ مرزا غالب نے ایک شعر میں آپ ﷺ کی عظمت کو کیا ہی واشگاف انداز میں بیان کیا:

غالب ثناے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

گویا کہ ہم ایسے ادنیٰ آپ ﷺ کی عظمت کو جاننے پہچاننے سے یکسر قاصر ہیں۔ جب ذکر غالب کا چل نکلا تو دیکھیے کہ غالب نے خود کو گنجینۂ معنی کا طلسم قرار دیا، اور اسی طلسم کو اس نے نعت میں بھی برقرار رکھا، غالب کا بہت مشہور شعر ہے:

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

بظاہر تو یہ عام سا شعر معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ایک نکتہ جو ہمارے استاد جناب ڈاکٹر شاداب احسانی صاحب نے بیان کیا، نکتہ یہ ہے کہ جب ہم ''محمد'' کہتے ہیں، تو میم پر ہمارے ہونٹ باہم مل جاتے ہیں اور گویا ایک بوسے کی سی شکل بن

جاتی ہے، یہی غالب بھی کہتے ہیں کہ اسم محمد ﷺ ایسا بابرکت اسم ہے کہ اسے ادا کرتے وقت خود بخود ہونٹوں سے بوسہ جاری ہو جاتا ہے۔

نعت کے موضوعات

نعت کے موضوعات کی بات کریں تو ہمارے ہاں متنوع قسم کے موضوعات ملتے ہیں جن کا تعلق شاعر کی قلبی کیفیت کے ساتھ ہے۔ آپ ﷺ کے مخالفین کی ہجو اور آپ ﷺ کی مدحت کی مثالیں تو گزر چکیں اس کے علاوہ بھی نعت گو حضرات نے مختلف پہلوؤں سے نعتیں لکھیں۔ کہیں آپ ﷺ کی جود و سخا اور رافت و رحمت کو نظم کیا گیا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ　　یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

اور

جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں　　دینے والا نظر نہیں آتا
زیرِ سایہ ہوں اس کے اے امجدؔ　　جس کا سایہ نظر نہیں آتا

کسی نے مدینہ طیبہ کے پاکیزہ ماحول کا تذکرہ کیا:

مدینے جا کے ہم سمجھے تقدس کس کو کہتے　　ہوا پاکیزہ پاکیزہ فضا سنجیدہ سنجیدہ

اور کسی کی نعت روضۂ اقدس ﷺ کی تعریف و توصیف پر مشتمل نظر آئی:

پھر پیشِ نظر گنبدِ خضرا ہے، حرم ہے　　پھر نامِ خدا، روضۂ جنت میں قدم ہے
پھر شکرِ خدا، سامنے محرابِ نبی ہے　　پھر سر ہے مرا اور ترا نقشِ قدم ہے
محرابِ نبی ہے کہ کوئی طورِ تجلی　　دل شوق سے لبریز ہے اور آنکھ بھی نم ہے

کبھی نعت کہتے کہتے گناہوں کی یاسیت یوں نوکِ زباں پر آجاتی ہے:

زِ کردہ خویش حیرانم، سیہ شُد روزِ عصیانم پشیمانم، پشیمانم، پشیماں، یا رسول اللہ
چوں بازوے شفاعت را، کُشائی بر گنہ گاراں مُکن محروم جامی را، درا آں، یا رسول اللہ

ترجمہ: میں اپنے کیے پر حیران ہوں اور گناہوں سے سیاہ ہو چکا ہوں۔ پشیمانی اور شرمندگی سے پانی پانی ہو رہا ہوں، یا رسول اللہ۔ اے اللہ کے رسول! روز محشر جب آپ شفاعت کا بازو گناہ گاروں پر کشادہ فرمائیں تو اس وقت جامی کو محروم نہ رکھیے گا۔

تو کبھی امت کی زبوں حالی مناجات کی صورت اختیار کر جاتی ہے:

نبیِ اکرم شفیعِ اعظم، دکھے دلوں کا پیام لے لو تمام دنیا کے ہم ستائے کھڑے ہوئے ہیں سلام لے لو
شکستہ کشتی ہے تیز دھارا، نظر سے روپوش ہے کنارا نہیں کوئی ناخدا ہمارا، خبر تو عالی مقام لے لو
یہ کیسی منزل پہ آ گئے ہیں نہ کوئی اپنا نہ ہم کسی کے تم اپنے دامن میں آج آقا تمام اپنے غلام لے لو

بہر حال نعت کے متعدّد پہلو ہیں جنھیں عربی، فارسی اور اردو شعرا نے اپنے اپنے ذوق اور فنی مہارت کو بروے کار لا کر اس کارِ عظیم میں حصہ لیا۔ البتہ ایک طرز نعت کا شعرا کے یہاں ایسا بھی پایا جاتا ہے جسے بالاتفاق ممنوع قرار دیا گیا ہے اور وہ ہے نعت میں نبی پاک ﷺ کو خدائی صفات سے متّصف کرنا، جسے شرک بھی کہا گیا، چنانچہ بہت سے معروف نقادوں نے نعت گو شعرا کو دو باتوں پر خاص تنبیہ کی: اول تو یہی کہ نعت میں اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ نبی اکرم سرکارِ دوعالم ﷺ کی تعریف و توصیف میں حدودِ شریعت سے تجاوز نہ کیا جائے۔ شرعی حدود سے تجاوز دریں معنیٰ کہ نعت کہتے کہتے دیگر شعائرِ دینی کی توہین نہ ہو جائے، آقائے دو جہاں ﷺ کو اللہ رب العزت کے بالمقابل دکھانا یا اللہ تعالیٰ کا آنحضرت ﷺ کی سفارش کے آگے بے بس ہونا، یا آپ ﷺ کو نعوذ باللہ ذاتِ باری تعالیٰ کا حصہ قرار دے دینا یا آپ ﷺ کا دیگر انبیا سے اس طرح تقابل کرنا کہ دیگر انبیا کی تحقیر لازم آئے وغیرہ۔

دوسری بات جسے نقادوں نے نعت گوئی کے لیے لازمی قرار دیا وہ یہ کہ نعت وہ کہے جسے زبان و بیان پر خوب قدرت ہو، فن سے واقف ہو اور اس بحرِ بے کراں میں غوطہ زنی کرتے کرتے ایک تجربہ حاصل کر چکا ہو۔ ہمارے ہاں

رواج یہ ہے کہ جس پر شاعری کا بھوت سوار ہوا اس نے جھٹ ایک نعت لکھ ڈالی جس میں نہ وزن نہ قافیہ، نہ کوئی مضمون نہ تراکیب، چند منتشر جملے نعت کے نام پر لکھ لیے اور جگہ جگہ نشر کر دیے، پھر نشر کرتے وقت اپنا نام مع تخلص لکھنا بھی ان متشاعرین کے لیے ضروری ہے، اور تخلص بھی مجرد نہیں لکھا جاتا بلکہ اس پر ڈوئی بھی ڈالی جاتی ہے تاکہ قارئین کو بخوبی علم ہوسکے کہ یہ کس عظیم شاعر کا کلام ہے۔ مزید یہ کہ یہ کلام چونکہ نعت کے عنوان سے نشر ہوتا ہے تو لوگ اس پر تنقید سے گھبراتے ہیں مبادا نعت کی بے حرمتی نہ ہوجائے حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ممدوح جتنا اعلیٰ ہو مدح بھی اتنی ہی اعلیٰ یا کم ازکم کسی نہ کسی حد تک فنی خوبیوں کی حامل ہونی چاہیے۔ اسی مضمون کو معروف نقاد ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے یوں بیان کیا ہے: ”نعت کے موضوع سے عہدہ برآں ہونا آسان نہیں، موضوع کا احترام کلام کی بے کیفی اور بے رونقی کی پردہ پوشی کرتا ہے، نقاد کو نعت گو سے باز پُرس کرنے میں تامّل ہوتا ہے اور دوسری طرف نعت گو کو اپنی فنی کمزوری چھپانے کے لیے نعت کا پردہ بھی بہت آسانی سے مل جاتا ہے، شاعر ہر مرحلے پر اپنے معتقدات کی آڑ پکڑتا ہے اور نقاد جہاں کا تہاں رہ جاتا ہے لیکن نعت گوئی کی فضا جتنی وسیع ہے اتنی ہی اس میں پرواز مشکل ہے“۔ (ابو اللیث صدیقی، لکھنو کا دبستان شاعری)

شاہ معین الدین ندوی اس بارے میں لکھتے ہیں: ”نعت کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ محض شاعری کی زبان میں ذاتِ پاک نبی ﷺ کی عامیانہ توصیف کر دینا بہت آسان ہے، لیکن اس کے پورے لوازم و شرائط سے عہدہ برا ہونا بہت مشکل ہے۔ حُبِ رسول ﷺ کے ساتھ نبوت کے اصلی کمالات اور کارناموں، اسلام کی صحیح روح، عہدِ رسالت کے واقعات اور آیات و احادیث سے واقفیت ضروری ہے، جو کم شعرا کو ہوتی ہے۔ اس کے بغیر صحیح نعت گوئی ممکن نہیں۔ نعت کا رشتہ بہت نازک ہے۔ اس میں ادنیٰ سی لغزش سے نیکی برباد، گناہ لازم آجاتا ہے۔ اس پلِ صراط کو عبور کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہ بارگاہِ اقدس ہے جہاں بڑے بڑے قدسیوں کے پاؤں لرز جاتے ہیں“۔ (ادبی نقوش ص: ۲۸۴)

مولانا احمد رضا خان بریلوی نے نعت گوئی کی احتیاطیں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ”حقیقتاً نعت شریف لکھنا بہت

مشکل کام ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں، اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ اگر شاعر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہے۔ البتہ حمد آسان ہے کہ اس میں راستہ صاف ہے، جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے، غرض حمد میں یک جانب کوئی حد نہیں اور نعت شریف میں دونوں جانب سخت حد بندی ہے"۔(الملفوظ، حصہ دوم، مکتبہ قادریہ، ص:۱۸۴)اعلیٰ حضرت کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں وہ اسی احتیاط کا ذکر کرتے ہیں:

پیشِ نظر وہ نو بہار، سجدے کو دل ہے بے قرار روکیے سر کو روکیے، ہاں یہی امتحان ہے

اردو نعت

اردو نعت کے ارتقا کے حوالے سے "نعت کائنات" سے ایک پیراگراف پیش ہے جس میں مختصراً نعتِ رسول ﷺ کا بتدریج ارتقا اور معروف نعت گو شعرا کے نام ہیں: "اُردو میں شاعری کی ابتدا ارضِ دکن سے ہوئی۔ دکنی مثنویوں میں فارسی مثنویوں کی طرح حمد کے بعد نعتیہ اشعار ملتے ہیں۔ ان اشعار کو مثنوی سے الگ کر لیا جائے، تو بعض اوقات اعلیٰ درجے کی نعتیں ہمیں متحیر کر دیتی ہیں۔ مثلاً زبان کی قدامت کے باوجود وجہی کی "قطب مشتری" کے نعتیہ اشعار نہایت عمدہ ہیں اور صنفِ نعت کے جملہ تقاضے پورے کرتے ہیں۔ دکن کے بعد دہلی اور لکھنؤ کے مثنوی نگار بھی اس روایت پر عمل پیرا ہونے کو فرض کی طرح ادا کرتے رہے۔ اسی لیے قلی قطب شاہ اور محمد شاہ کو اُردو کے پہلے نعت گو شاعر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اُن کے کلام کا خاصا حصہ نعتِ رسول ﷺ پر مشتمل ہے۔ اسی لیے ولی دکنی کے دَور سے لے کر عہدِ جدید کے شعرا تک نعت گوئی کا سلسلہ برابر قائم ہے اور اُردو کا ہر شاعر نعت کہنا اپنے لیے باعثِ سعادت تصور کرتا ہے۔ اُردو نعت گوئی میں، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، امیر مینائی، مولانا ظفر علی خاں، بہزاد لکھنوی، حفیظ جالندھری، ماہر القادری جیسے نام ہیں، جو معتبر اور معروف ہوئے۔ دَور حاضر میں بھی نعتیہ شعرا کی بہت بڑی تعداد ہے۔ خاص طور سے قریۂ اسم محمد ﷺ (پاکستان) میں نعت گوئی کو کافی عروج حاصل ہوا ہے، وہاں نعتوں پر تحقیق کا بھی خاصا کام ہوا ہے۔ پاکستان کے نعتیہ شعرا میں حفیظ تائب، عبد العزیز خالد، مظفر وارثی، خالد احمد، مشکور حسین یاد اور ریاض مجید نے نعت کو نیا رنگ و آہنگ دیا ہے اور نئی لفظیات سے آراستہ کیا۔ ہندوستان کے اُردو اور فارسی شعرا میں نہ

صرف مسلمان بلکہ اہل ہنود نے بھی نعتیں لکھی ہیں۔ اُن میں کئی تو ایسے ہیں، جن کے نعتیہ کلام کے دواوین بھی موجود ہیں"۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ایک جگہ لکھتے ہیں: "نعت گوئی، عشقِ رسول اور شوقِ مدینہ ہندوستانی شعرا کا محبوب موضوع رہا ہے اور فارسی شاعری کے بعد سب سے بہتر اور سب سے مؤثر نعتیں اردو ہی میں ملتی ہیں"۔ (کاروانِ مدینہ، مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام، ندوہ، لکھنؤ)

یہاں تک تو نعت کے ارتقا، موضوعات اور حساسیت و نزاکت پر بات ہوئی، اب ذیل میں اردو کے چند معروف نعت گو شعرا کے مختصر حالات اور نعتیہ کلام کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں، حالات اور نعتیہ کلام کا اکثر حصہ "ریختہ" اور "نعت کائنات" سے ماخوذ ہے:

محسن کاکوروی

نام مولوی محمد محسن، تخلص محسن، ۱۸۳۷ء کو قصبہ کاکوری مضافات لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اپنے دادا کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی۔ ان کے انتقال کے بعد اپنے والد اور مولوی عبدالرحیم سے علم کی تحصیل کی۔ مولوی ہادی علی اشک جنھیں شاعری پر عبور تھا، انہی سے محسن کاکوروی نے اصلاحِ سخن لی۔ محسن کاکوروی نے چند روز عہدۂ نظامت پر کام کیا اور وہیں سے وکالتِ ہائی کورٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں صدر دیوانی عدالت آگرہ میں تھی۔ ۱۸۵۷ء تک آگرہ میں رہے۔ بعد ازاں مین پوری میں وکالت کرتے رہے۔ شعر و سخن کا شوق انھیں لڑکپن سے تھا۔ ابتدا میں کچھ غزلیں کہیں۔ اس کے بعد محض نعت میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ ۲۴/اپریل ۱۹۰۵ء کو مین پوری میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ محمد دانش غنی لکھتے ہیں: "اردو کے تمام شاعروں میں محسنؔ کاکوروی وہ واحد شاعر ہیں جنھیں اصلاً نعت گو شاعر ہونے کے باوجود بھی اردو کے تنقید نگاروں نے اساتذہ کی صف میں جگہ دی۔ یہ جگہ بنیادی طور پر انھیں ان کے قصیدے مدیح خیر المرسلین (۱۹۷۶ء) کے باعث عطا کی گئی ہے جو بلا شبہ ان کی شاعری کا شاہکار ہے۔ یہ ایک نعتیہ قصیدہ ہے جو فکری و فنی لحاظ سے انتہائی جاندار اور پر زور ہے۔ اس میں الفاظ کی متانت و جذالت، استعارے کی جدت، تشبیہات کی لطافت و تازگی، بندش کی چستی، خیالات کی نزاکت و بلندی قدم قدم پر پائی جاتی ہے لیکن یہ قصیدہ ناقدین اور ماہرینِ فن میں اختلاف و تنازع کا باعث بھی رہا ہے۔

اس کی وجہ اس قصیدے کی تشبیب میں ہندوستانی ماحول اور مذہبی فضا کی عکس ریزی ہے“۔اس قصیدے کے بارے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں: ”ایسی نرالی تشبیب آپ کو اردو کے کسی شاعر کے ہاں نہیں ملے گی۔ ذوقؔ و سوداؔ قصیدے کے بادشاہ ہیں لیکن ان کی کسی تشبیب میں ایسی جدت اور زور نہیں۔“ (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ص۵۰۹)

سخن کو رتبہ ملا ہے مری زباں کے لیے
زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیاں کے لیے
زمیں بنائی گئی کس کے آستاں کے لیے
کہ لا مکاں بھی اٹھا سر و قد مکاں کے لیے
ترے زمانے کے باعث زمیں کی رونق ہے
ملا زمین کو رتبہ ترے زماں کے لیے

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل
میرے ایمانِ مفصل کا یہی ہے مجمل
ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ، نہ غزل
دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے
صرف تیرا ہی بھروسہ، تری قوت، ترا بل
ہو مرا ریشۂ امید وہ نخلِ سر سبز
جس کی ہر شاخ میں ہو پھول ہر اِک پھول میں پھل
آرزو ہے کہ ترا دھیان رہے تا دمِ مرگ

شکل تیری نظر آئے مجھے، جب آئے اجل
روح سے میری کہیں، پیار سے یوں عزرائیل
کہ مری جان مدینے کو جو چلتی ہے تو چل
دمِ مردن یہ اشارہ ہو شفاعت کا تری
فکرِ فردا تُو نہ کر دیکھ لیا جائے گا کل
یادِ آئینۂ رُخسار سے حیرت ہو مجھے
گوشۂ قبر نظر آئے مجھے شیش محل
میزباں بن کے نکیرین کہیں: گھر ہے ترا
نہ اُٹھانا کوئی تکلیف نہ ہونا بے کل
رُخِ انور کا ترے دھیان رہے بعدِ فنا
میرے ہمراہ چلے راہِ عدم میں مشعل
حذف ہوں میرے گناہانِ ثقیل اور خفیف
آئیں میزاں میں جب افعالِ صحیح و معتل
مری شامت سے ہو آراستہ گیسوئے سیاہ
عارضِ شاہدِ محشر ہو اگر حُسنِ عمل
صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مدّاح
ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ، یہ غزل
کہیں جبریل اشارے سے: ہاں! بسم اللہ
سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

امیر مینائی

امیر مینائی کا نام امیر احمد تھا۔ وہ نواب نصیر الدین حیدر کے عہد میں سنہ ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ امیر مینائی نے شروع میں اپنے بڑے بھائی اور والد سے تعلیم پائی اور اس کے بعد مفتی سعد اللہ مرادآبادی سے فارسی، عربی اور ادب میں مہارت حاصل کی۔ انھوں نے علمائے فرنگی محل سے بھی فقہ واصول کی تعلیم حاصل کی لیکن ان کا اپنا کہنا ہے کہ علومِ متداولہ کی تکمیل ان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ان کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا، پندرہ سال کی عمر میں منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد ہو گئے جو اپنے زمانے کے مشہور شاعر اور ماہرِ عروض تھے۔ امیر کے کلام اور ان کے کمال کی تعریفیں سن کر ۱۸۵۲ء میں نواب واجد علی شاہ نے ان کو طلب کیا اور ۲۰۰ روپے ماہانہ پر اپنے شہزادوں کی تعلیم کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ امیر مینائی طبعاً شریف النفس، پاک باز، عبادت گزار اور متّقی تھے۔ درگاہِ صابریہ کے سجّادہ نشین امیر شاہ صاحب سے بیعت وخلافت کا شرف حاصل تھا۔ مزاج میں توکل، فقیری اور استغنا تھا جس نے تواضع اور انکسار کی صفات کو چمکا دیا تھا۔ ان کے بارے میں حکیم عبد الحیٔ کہتے ہیں: ”وہ مسَلَّمُ الثبوت استاد تھے، کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے دست وگریباں ہے، بندش کی چستی اور تراکیب کی درستی سے لفظوں کی خوب صورتی پہلو بہ پہلو جوڑتے ہیں“۔ ان کے بہت سے شعر زباں زدِ خاص وعام ہیں۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والا شاید ہی کوئی شخص ہو گا جس نے ان کا یہ شعر: ”خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر* سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے“ نہ سنا ہو۔ محامدِ خاتم النبیین ان کا نعتیہ کلام ہے۔ ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد میں وفات پائی۔

بھاتا نہیں کوئی، نظر آتا نہیں کوئی
دل میں وہی آنکھوں میں وہی چھائے ہوئے ہیں

خلق کے سرور، شافعِ محشر صلی اللہ علیہ و سلم
مرسلِ داور، خاص پیمبر صلی اللہ علیہ و سلم
نورِ مجسم، نیرِ اعظم، سرورِ عالم، مونسِ آدم

نوح کے ہمدم، خضر کے رہبر صلی اللہ علیہ و سلم
بحرِ سخاوت، کانِ مروت، آیۂ رحمت، شافعِ اُمت
مالکِ جنت، قاسمِ کوثر صلی اللہ علیہ و سلم
رہبرِ موسیٰ، ہادیِ عیسیٰ، تارکِ دنیا، مالکِ عقبیٰ
ہاتھ کا تکیہ، خاک کا بستر صلی اللہ علیہ و سلم
سروِ خراماں، چہرہ گلستاں، جبہۂ تاباں، مہرِ درخشاں
سنبلِ پیچاں، زلفِ معنبر صلی اللہ علیہ و سلم
قبلۂ عالم، کعبۂ اعظم، سب سے مقدم، راز سے محرم
جانِ مجسم، روحِ مصور صلی اللہ علیہ و سلم
مہر سے مملو ریشہ ریشہ، نعت امیرؔ اپنا ہے پیشہ
ورد ہمیشہ، دن بھر، شب بھر صلی اللہ علیہ و سلم

دل آپ پر تصدق، جاں آپ پر سے صدقے
آنکھوں سے سر ہے قرباں، آنکھیں ہیں سر سے صدقے
کہتے ہیں گرد عارض، باہم یہ دونوں گیسو
میں ہوں ادھر سے صدقے، تو بھی ادھر سے صدقے
کہتا ہے مہر؛ مہ سے، رخ دیکھ کر نبی کا
تو شام سے ہے قرباں، میں ہوں سحر سے صدقے
بولے ملک، جو آدم نازاں ہوئے ولا پر

تم آج ہو فدائی، ہم پیشتر سے صدقے
جو مال امیر کا ہے، مالک ہیں آپ اس کے
دل آپ پر سے صدقے جاں آپ پر سے صدقے

الطاف حسین حالی

الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ حالی نے ابتدائی تعلیم پانی پت میں ہی حاصل کی اور قرآن حفظ کیا۔ پانی پت اور دہلی میں انھوں نے کسی ترتیب و نظام کے بغیر فارسی، عربی، فلسفہ و منطق اور حدیث و تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ادب میں انھوں نے جو خاص بصیرت حاصل کی وہ ان کے اپنے شوق، مطالعے اور محنت کی بدولت تھی۔ دہلی کے قیام کے دوران وہ مرزا غالب کی خدمت میں حاضر رہا کرتے تھے اور ان کے بعض فارسی قصائد ان ہی سے سبقاً پڑھے۔ اس کے بعد وہ خود بھی شعر کہنے لگے اور اپنی کچھ غزلیں مرزا کے سامنے بغرضِ اصلاح پیش کیں تو انھوں نے کہا: ''اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیتا لیکن تمھاری نسبت میرا خیال ہے کہ تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے''۔ ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، رئیسِ دہلی سے ہوئی جو ان کو اپنے ساتھ جہانگیر آباد لے گئے اور انھیں اپنا مصاحب اور اپنے بچوں کا اتالیق بنا دیا۔ شیفتہ؛ غالب کے دوست، اردو فارسی کے شاعر تھے اور مبالغے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ سیدھی سادی اور سچی باتوں کو حسنِ بیان سے دلفریب بنانے کو شاعری کا کمال سمجھتے تھے اور عامیانہ خیال سے متنفر تھے۔ حالی کی شاعرانہ ذہن سازی میں شیفتہ کی صحبت کا بڑا دخل تھا۔ ۱۹۰۴ء میں حکومت نے انھیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔ شبلی نے انھیں خطاب دیے جانے پر کہا کہ اب صحیح معنوں میں اس خطاب کی عزت افزائی ہوئی۔ حالی شرافت اور نیک نفسی کا مجسمہ تھے۔ مزاج میں ضبط و اعتدال، رواداری اور بلند نظری ان کی ایسی خوبیاں تھیں جن کی جھلک ان کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ اردو ادب کی جو وسیع و عریض، خوبصورت اور دلفریب عمارت آج نظر آتی ہے اس کی بنیاد کے پتھر حالی نے ہی بچھائے تھے۔ اپنی مسدسِ مد و جزرِ اسلام میں وہ قوم کی زبوں حالی پر خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ مسدس نے سارے ملک میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ اپنی

مثال آپ تھی۔ سر سید احمد خان کہا کرتے تھے: ”اگر روزِ محشر خدا نے پوچھا کہ دنیا سے اپنے ساتھ کیا لایا تو کہہ دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوائی“۔ ۱۹۱۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا

اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

احمد رضا خاں بریلوی

آپ کا نام احمد رضا تھا، رضا تخلص کرتے تھے۔ ولادت ۱۸۵۶ء میں ہندوستان کے مشہور شہر بریلی میں ہوئی۔ آپ کی تربیت ایک علمی گھرانے میں ہوئی جس کے نتیجے میں آپ نے صرف چار، پانچ برس کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کر لیا تھا اور اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں اور حیرت انگیز قوتِ حافظہ کی بنا پر صرف تیرہ سال اور دس ماہ کی عمر میں علمِ تفسیر، حدیث، فقہ و اصولِ فقہ، منطق و فلسفہ، علمِ کلام اور مروجہ علومِ دینیہ کی تکمیل کر لی۔ زبان و بیان پر آپ کی گرفت بہت مضبوط تھی، چنانچہ آپ کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی الندوی لکھتے ہیں: ''وہ نہایت کثیر المطالعہ، وسیع المعلومات اور متبحر عالم تھے، رواں دواں قلم کے مالک اور تصنیف و تالیف میں جامع فکر کے حامل تھے''۔ اسی طرح مولانا انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں: ''مولانا احمد رضا خاں صاحب کی تحریریں شستہ اور مضبوط ہیں، جسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مولوی احمد رضا صاحب ایک زبردست عالمِ دین اور فقیہ ہیں''۔ ۱۹۲۱ء میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ شاعری میں ان کے پیشِ نظر مداحِ رسول ﷺ سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی مشعلِ راہ تھی۔ اپنے دور کے شعرا میں مولانا کفایت علی کافی کی نعت گوئی سے متاثر تھے۔ آپ کا دیوان حدائقِ بخشش کے نام سے شائع ہوا۔ نعتیہ کلاموں کے حوالے سے جو مقبولیت اور پذیرائی احمد رضا خان بریلوی کی نعتوں کو ملی ہے وہ بے مثال ہے۔ عابدؔ نظامی

لکھتے ہیں: ”یہ کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں، بلکہ عینِ حقیقت ہے، ان کے اشعار پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فصاحت وبلاغت، حلاوت وملاحت، لطافت ونزاکت یہ سب ان کے ہاں کی لونڈیاں ہیں“۔ بقول شان الحق حقی: ”میرے نزدیک مولانا کا نعتیہ کلام ادبی تنقید سے مبرا ہے۔ اس پر کسی ادبی تنقید کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی مقبولیت اور دلپذیری ہی اس کا سب سے بڑا ادبی کمال اور مولانا کے مرتبے پر دال ہے“۔ کوثر نیازی نے آپ کے بارے میں لکھا: ”بریلی شریف میں ایک شخص پیدا ہوا جو نعت گوئی کا امام تھا اور احمد رضا خاں جس کا نام تھا“۔

مصطفٰی جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

سب سے اولٰی و اعلٰی ہمارا نبی
سب سے بالا و والا ہمارا نبی
بجھ گئیں جس کے آگے سبھی مشعلیں
شمع وہ لے کر آیا ہمارا نبی

سرور کہوں کہ مالک و مولٰی کہوں تجھے
باغِ خلیل کا گلِ زیبا کہوں تجھے

حرماں نصیب ہوں تجھے اُمید گہ کہوں
جانِ مراد و کانِ تمنا کہوں تجھے
اللہ رے تیرے جسم منور کی تابشیں

اے جانِ جاں میں جانِ تجلّٰی کہوں تجھے
مجرم ہوں اپنے عفو کا ساماں کروں شہا
یعنی شفیع روزِ جزا کا کہوں تجھے
تیرے تو وصف عیب تناہی سے ہیں بری
حیراں ہوں میرے شاہ میں کیا کیا کہوں تجھے
لیکن رضاؔ نے ختم سخن اس پہ کر دیا
خالق کا بندہ خلق کا آقا کہوں تجھے

گنہ گاروں کو ہاتف سے نویدِ خوش مآلی ہے
مُبارک ہو شفاعت کے لیے احمد سا والی ہے
قضا حق ہے مگر اس شوق کا اللہ والی ہے
جو اُن کی راہ میں جائے وہ جان اللہ والی ہے
تِرا قدِ مبارک گلبنِ رحمت کی ڈالی ہے
اسے بو کر تِرے رب نے بنا رحمت کی ڈالی ہے
میں اک محتاجِ بے وقعت گدا تیرے سگِ در کا
تِری سرکار والا ہے، تِرا دربار عالی ہے
تِری بخشش پسندی، عذر جوئی، توبہ خواہی سے
عمومِ بے گناہی جرم شانِ لا اُبالی ہے
ابو بکر و عمر، عثمان و حیدر جس کے بلبل ہیں

ترا سروِ سہی اس گلبنِ خوبی کی ڈالی ہے
رضاؔ قسمت ہی کھل جائے، جو گیلاں سے خطاب آئے
کہ تو ادنیٰ سگِ درگاہِ خدامِ معالی ہے

ظفرعلی خان

ظفرعلی خان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے، مدیر بھی اور آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے والے ایک سرگرم سیاسی کارکن بھی۔ ان کی پیدائش ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کرم آباد میں حاصل کی اور اس کے بعد اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ میں زیرِ تعلیم رہے۔ مولانا ظفرعلی خاں اس وقت کے مشہور روزنامے ''زمیندار'' کے مدیر رہے۔ اس اخبار نے اپنے وقت میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل و معاملات کی عکاسی اور سماج کے ایک بڑے طبقے میں ان مسائل کے حوالے سے رائے سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا کی شاعری بھی ان کی اسی سیاسی اور سماجی جدوجہد کا ایک ذریعہ رہی، ان کی نظموں کے موضوعات ان کے وقت کی اتھل پتھل کے اردگرد گھومتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں وقتی تقاضوں کے پیشِ نظر تخلیق کی گئی ہیں۔ شفیق الرحمن؛ ظفرعلی خان کا تعارف بہت عمدہ انداز میں یوں کراتے ہیں: ''وہ شاعری کی جملہ اصناف پر قدرتِ کاملہ اور مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، نظم اور نعت کون سی صنف سخن تھی جس پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہو اور اربابِ فن سے داد وصول نہ کی ہو''۔ آپ کو عربی، فارسی، انگریزی اور اردو زبان پر یکساں عبور تھا۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں سرسید احمد خان کی صدارت میں منعقدہ اجلاس میں انھیں یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ طلبہ برادری کی طرف سے ان کی قومی اور علمی خدمات پر انھیں خراجِ تحسین پیش کریں۔ اس موقعے پر ظفرعلی خان نے فارسی میں اپنا لکھا ہوا ایک قصیدہ پیش کیا۔ یہ قصیدہ اُن کی قادر الکلامی کا شہ پارہ تھا۔ اوائلِ شباب ہی میں مولانا کی خلاقانہ اہلیتوں اور موزونیِ طبع نے مولانا الطاف حسین حالی ایسے کہنہ مشق بزرگ شاعر کو ان کی تحسین وستائش پر اس حد تک مجبور کردیا کہ مسدس کے خالق نے انھیں ''فخرِ اَقران'' قرار دیا۔ ان کا شعر ''وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں... اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں'' زبان زدِ عام ہے۔ ۲۷ نومبر

۱۹۵۶ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی تو ہو
پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اس نورِ اولیں کا اجالا تمھی تو ہو
سب کچھ تمھا رے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اولی تمھی تو ہو

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اکِ روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
رحمت کی گھٹائیں پھیل گئیں افلاک کے گنبد گنبد پر
وحدت کی تجلی کوند گئی آفاق کے سینا زاروں میں
گر ارض وسما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہوں گلزاروں میں، یہ نور نہ ہو سیاروں میں
وہ جنس نہیں ایمان جسے، لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو،یہ قرآں کے سیپاروں میں
جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

علامہ اقبال

۹/نومبر۱۸۷۷ءکوسیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی ادب اور اسلامیات کی تعلیم مولوی میر حسن سے حاصل کی۔۱۸۹۵ءمیں لاہور آ گئے۔ ۱۹۲۲ءمیں ان کی اعلیٰ قابلیت کے باعث انھیں "سر" کا خطاب ملا۔ اقبال نے شروع میں کچھ غزلیں ارشد گورگانی کو دکھائیں۔ داغ سے بذریعہ خط کتابت بھی تلمذ رہا۔ اقبال بیسویں صدی کے اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ان کے اردو مجموعہ ہائے کلام کے نام یہ ہیں: "بانگِ درا"، "بالِ جبریل"، "ضربِ کلیم"، "ارمغانِ حجاز" (اردو اور فارسی کلام)۔ "کلیاتِ اقبال" اردو بھی چھپ گئی ہے۔ فارسی تصانیف کے نام یہ ہیں: "اسرارِ خودی"، "رموزِ بے خودی"، "پیامِ مشرق"، "زبورِ عجم"، "جاوید نامہ"، "مسافر"، "پس چہ باید کرد"۔ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ءکو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہر چند اقبال نے رسمی معنوں میں کبھی نعت نہیں کہی تاہم عشقِ رسول ﷺ کا یہ عالم ہے کہ اُن کا تخیل بار بار انھیں بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں لے جاتا ہے، جہاں وہ ملتِ اسلامی کی زبوں حالی پر فریاد کناں نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر عزیز احسن: "اقبال کے شعری سرمائے میں جہاں جہاں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ذکرِ مبارک آیا ہے اس میں عمومیت سے زیادہ محرکاتِ عشق کا اختصاصی پہلو جھلکتا ہے۔ اقبال کی فکری دنیا میں جتنے نکات منصبِ رسالت کی تفہیم کے ضمن میں منصۂ شہود پر آئے وہ شاید ہی کسی اور شاعر یا مسلمان مفکر کی تحریروں میں آئے ہوں۔ حضورِ اکرم ﷺ کی ذات والا صفات سے اقبال کا عشق جدید و قدیم فکری زاویوں سے روشناس لوگوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اور مبنی بر اخلاص بھی۔ شدتِ حُبِّ رسول ﷺ کا اظہار ان کے متعدّد اشعار میں جا بجا ملتا ہے"۔ خان نیاز الدین خان کے نام ایک مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں: "میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی ان کی صحبت سے اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہو گا۔ اس واسطے خاموش رہتا ہوں"۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کردے

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیِ سینا
نگاہِ عشق ومستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰس، وہی طٰہٰ

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خُم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا ایستادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب!
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب!
شوکتِ سنجرؒ و سلیمؒ تیرے جلال کی نمود!
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب!
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!
تیری نگاہِ ناز سے، دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو! عشق، حضور و اضطراب

ابوالاثر حفیظ جالندھری

نام محمد حفیظ، ابوالاثر کنیت، حفیظ تخلص، ۱۴؍ جنوری ۱۹۰۰ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ مروجہ دینی تعلیم کے بعد اسکول میں داخل ہوئے۔ حفیظ کو بچپن ہی سے شعروسخن سے دلچسپی تھی۔ مولانا غلام قادر گرامی جوان کے ہم وطن تھے، ان کے سامنے زانوے تلمذتہ کیا۔ اردو زبان میں ایک ماہانہ رسالہ ”اعجاز“ جاری کیا جو پانچ ماہ بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۲۲ء میں لاہور آئے۔ ان کا شروع سے اس وقت تک شعروادب اوڑھنا بچھونا تھا۔ رسالہ ”شباب“میں ملازمت کرلی۔ اس کے بعد ”نونہال“ اور ”ہزار داستان“ کی ادارت ان کے سپرد ہوئی۔ پھر ”پھول“ اور ”تہذیبِ نسواں“ سے منسلک رہے۔ کچھ عرصہ ریاست خیرپور کے درباری شاعر رہے۔ قومی ترانے کے خالق کی حیثیت سے حفیظ کو بہت شہرت ملی۔ شاہنامۂ اسلام ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ حفیظ جالندھری کے بارے اظہر جاوید لکھتے ہیں: ”جو کام حفیظ جالندھری نے شاعری سے لیا ہے وہ منفرد، یکتا اور سب سے بالا ہے۔ وہ شاعر تو بے مثل ہے ہی۔ حیرت اور مسرت کی بات ہے کہ ان کا

اسلامی تاریخ کا مطالعہ بہت گہرا ہے اور انھوں نے اسے جس طرح ہضم کر کے شعروں میں پرویا ہے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں، نہایت سادہ بیان لیکن پر وقار اور معیاری۔ حفیظ کو جس طرح اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی پر عبور اور ان کے استعمال کا ادراک ہے یہ ہمارے اردو زبان کے اور خصوصاً حفیظ کے ہم عصروں میں سے بہت کم ہی کو نصیب ہوا ہے"۔ ان کا مشہور شعر ہے: ہم میں ہی تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آسکے * تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمھیں بھلا سکے۔

غلاموں کو سریرِ سلطنت پر جس نے بٹھلایا
یتیموں کے سروں پر کر دیا اقبال کا سایا
گداؤں کو شہنشاہی کے قابل کر دیا جس نے
غرورِ نسل کا افسوں باطل کر دیا جس نے
وہ جس نے تخت اوندھے کر دیے شاہانِ جابر کے
بڑھائے مرتبے دنیا میں ہر انسانِ صابر کے
وہ جس کا ذکر ہوتا ہے، زمینوں آسمانوں میں
فرشتوں کی دعاؤں میں، موذن کی اذانوں میں
وہ جس کے معجزے نے نظمِ ہستی کو سنوارا ہے
جو بے یاروں کا یارا، بے سہاروں کا سہارا ہے
وہ نورِ لَم یزل جو باعثِ تخلیقِ عالم ہے
خدا کے بعد جس کا اِسمِ اعظم؛ اِسم اعظم ہے
ثنا خواں جس کا قرآں ہے، ثنا ہے جس کی قرآں میں
اُسی پر میرا ایماں ہے، وہی ہے میرے ایماں میں

سلام اے آمنہ کے لال، اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات، فخرِ نوع انسانی
سلام اے ظلِ رحمانی، سلام اے نورِ یزدانی
ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی
سلام اے سرِّ وحدت، اے سراجِ بزمِ ایمانی
زہے یہ عزت افزائی، زہے تشریف ارزانی
ترے آنے سے رونق آگئی گلزارِ ہستی میں
شریکِ حالِ قسمت ہو گیا پھر فضلِ ربانی
سلام اے صاحبِ خلقِ عظیم، انساں کو سکھلا دے
یہی اعمالِ پاکیزہ، یہی اشغالِ روحانی
تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ
تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی
اگرچہ فقرُ فخری رتبہ ہے تیری قناعت کا
مگر قدموں تلے ہے فرِ کسرائی و خاقانی

زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی
زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہو جائے
ترے پرتو سے مل جائے ہر اک ذرے کو تابانی
حفیظِؔ بے نوا کیا ہے، گدائے کوچۂ الفت

عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی
ترا در ہو مرا سر ہو، مرا دل ہو ترا گھر ہو
تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی
سلام، اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے
سلام، اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

ماہر القادری

ماہر القادری ایک بہترین نثر نگار اور کلاسیکی طرز کے شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ نام منظور حسین تھا۔ ۳۰ جولائی ۱۹۰۶ء کو کیسر کلاں ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ سے میٹرک کرنے کے بعد بجنور سے نکلنے والے مشہور اخبار "مدینہ" سے وابستہ ہو گئے۔ "مدینہ" کے علاوہ اور بھی کئی اخباروں اور رسالوں کی ادارت کی۔ ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء کو جدہ میں ایک مشاعرے کے دوران حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ مدحیہ شاعری میں سب سے زیادہ شہرت ان کے لکھے ہوئے سلام کو حاصل ہوئی جو منظرِ عام پر آتے ہی کلاسیک کا حصہ بن گیا۔ قیامِ حیدرآباد کے دوران میں جب نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر کا طوطی بولتا تھا، نواب صاحب نے قائداعظم سے ان کا تعارف یوں کرایا: "میری تقریروں اور ان (ماہر القادری) کی نظموں نے مسلمانانِ دکن میں بیداری پیدا کی ہے"۔ اعجاز رحمانی لکھتے ہیں: "میں نے مولانا ماہر القادری کو تقریباً بارہ، تیرہ سال بہت قریب سے دیکھا، بیشتر محفلوں اور مشاعروں میں ساتھ ساتھ رہا۔ میں نے مولانا کی ذات کو ہر مقام پر منفرد پایا۔ موصوف اپنی دانست میں نہ کبھی غلط بات کہتے تھے نہ سننے کے عادی تھے۔ ان کی صاف گوئی ایک مثال تھی۔ ماہر صاحب سعودی عرب میں مقیم تھے۔ شاہِ سعود کی جانب سے شاہی ضیافت کا دعوت نامہ ملا۔ دعوت رات کے ایسے وقت تھی جس میں شرکت سے عشا کی نماز حرم شریف میں نہیں ملتی، اس لیے دعوت میں شرکت نہیں کی۔ استفسار پر مولانا نے بتایا کہ میں اگر دعوت میں شریک ہوتا تو ایک لاکھ نمازوں کے ثواب سے محروم ہو جاتا۔ رسالہ فاران ماہر القادری نمبر میں ایک صاحب نے واقعہ لکھا کہ جب ماہر صاحب نے داڑھی رکھنا شروع کی، اور ایک ملاقات میں میں نے

داڑھی کی مبارکباد پیش کی تو آہستہ سے بولے: ”آپ کی مبارکباد کا شکریہ تاہم مجھے اس بات کی ندامت ہے کہ زندگی کا ایک بڑا عرصہ تارکِ سنت بن کر گزرا“۔ ۱۹۴۳ء میں جب یہ (سلام) کتابی شکل میں شائع ہوئی، تو مولانا مناظر احسن گیلانی نے دیباچے میں لکھا تھا: ”میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ یہ سلام کھٹمنڈو سے لے کر راس کماری تک مشہور ہوگا“ اور یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ ان کی ایک معرکہ آرا نظم ”قرآن کی فریاد“ انتہائی مقبول ہوئی۔

رسول مجتبیٰ کہیے، محمد مصطفیٰ کہیے
خدا کے بعد بس وہ ہیں، پھر اس کے بعد کیا کہیے
محمد کی نبوت دائرہ ہے نورِ وحدت کا
اسی کو ابتدا کہیے اسی کو انتہا کہیے
غبارِ راہِ طیبہ سرمۂ چشمِ بصیرت ہے
یہی وہ خاک ہے جس خاک کو خاکِ شفا کہیے
مدینہ یاد آتا ہے تو پھر آنسو نہیں رکتے
مری آنکھوں کو ماہرؔ، چشمۂ آب بقا کہیے

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پرکہ اسرارِ محبت جس نے سکھلائے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے

سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
سلام اس پر جو سچائی کی خاطر دکھ اٹھاتا تھا
سلام اس پر جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا
سلام اس پر جو امت کے لیے راتوں کو روتا تھا
سلام اس پر جو فرشِ خاک پر جاڑے میں سوتا تھا
سلام اس پر کہ جس کی چاند تاروں نے گواہ دی
سلام اس پر کہ جس کی سنگ پاروں نے گواہی دی
سلام اس پر کہ جس کا نام لے کر اس کے شیدائی
الٹ دیتے ہیں تختِ قیصریت اوجِ دارائی
سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں
سلام اس ذات پر جس کے پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالد و حیدر کے افسانے
درود اس پر کہ جس کی بزم میں قسمت نہیں سوتی
درود اس پر کہ جس کے ذکر سے سیری نہیں ہوتی
درود اس پر، جسے شمعِ شبستان ازل کہیے
درود اس ذات پر فخرِ بنی آدم جسے کہیے

اقبال عظیم

نام اقبال عظیم اور اقبال تخلص تھا۔ ۸/ جولائی ۱۹۱۳ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔آبائی وطن سہارن پور تھا۔ آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کا امتحان ۱۹۴۰ء میں پاس کیا۔ملازمت کا آغاز بہ حیثیتِ مدرس کیا۔ملازمت کے آخری پانچ برسوں میں صوبائی سکریٹریٹ نے ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے ان کی خدمات حاصل کرلیں۔اپریل ۱۹۷۰ء میں بینائی زائل ہونے کے باعث ڈھاکہ سے کراچی اپنے اعزہ کے پاس آگئے۔اقبال عظیم نے شعروسخن میں صفی لکھنوی اور وحشت کلکتوی سے اصلاح لی۔ ۲۲/ستمبر ۲۰۰۰ء کو کراچی میں انتقال کرگئے۔اردو شاعری کا آغاز زمانۂ طالبِ علمی سے ہی کیا۔نعت نگاری میں آپ نے خصوصی مقام پایا۔شاعری کا پہلا مجموعہ ''مضراب'' ۱۹۷۵ء میں شایع ہوا۔اقبال عظیم کا دوسرا مجموعہ نعتوں پر مشتمل ''قاب قوسین'' ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔عشقِ رسول ﷺ ان کی ہر ہر نعت سے جھلکتا ہے۔اقبال عظیم اپنے متعلق لکھتے ہیں: ''دیارِ رسول ﷺ تک رسائی کو میں اپنی زندگی کا حاصل اور ذوقِ غزل گوئی کا سب سے بڑا انعام جانتا ہوں''۔ ایک جگہ اپنی دلی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مدینے کی گلیوں کا کوئی گداگر مجھے آواز دے، میں اُڑ کر وہاں جا پہنچوں اور گنبدِ خضرا کے زیرِ سایہ بابِ جبریلؑ کی چوکھٹ پر بیٹھ کر ساری زندگی نعتِ رسول ﷺ کہتا رہوں، پڑھتا رہوں، کہتا رہوں، پڑھتا رہوں''۔

قیامت کا اک دن معین ہے لیکن، ہمارے لیے ہر نفَس ہے قیامت
مدینے سے ہم جاں نثاروں کی دوری، قیامت نہیں ہے، تو پھر اور کیا ہے

کھلا ہے سبھی کے لیے بابِ رحمت وہاں کوئی رتبے میں ادنیٰ نہ عالی
مرادوں سے دامن نہیں کوئی خالی، قطاریں لگائے کھڑے ہیں سوالی

جو پوچھا ہے تم نے، کہ میں نذر کرنے، کو کیا لے گیا تھا، تو تفصیل سن لو
تھا نعتوں کا اک ہار، اشکوں کے موتی، درودوں کا گجرا، سلاموں کی ڈالی
دھنی اپنی قسمت کا، ہے تو وہی ہے، دیارِ نبی جس نے آنکھوں سے دیکھا
مقدر ہے سچا مقدر اسی کا، نگاہِ کرم جس پہ آقا نے ڈالی
میں اُس آستانِ حرم کا گدا ہوں، جہاں سر جھکاتے ہیں شاہانِ عالم
مجھے تاجداروں سے کم مت سمجھنا، مرا سر ہے شایانِ تاجِ بلالی

مدینے کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ
جبیں افسردہ افسردہ قدم لغزیدہ لغزیدہ
چلا ہوں ایک مجرم کی طرح میں جانبِ طیبہ
نظر شرمندہ شرمندہ بدن لرزیدہ لرزیدہ
غلامانِ محمد دور سے پہچانے جاتے ہیں
دلِ گرویدہ گرویدہ سرِ شوریدہ شوریدہ
مدینے جا کے ہم سمجھے تقدس کس کو کہتے ہیں
ہوا پاکیزہ پاکیزہ فضا سنجیدہ سنجیدہ
وہی اقبالؔ جس کو ناز تھا کل خوش مزاجی پر
فراقِ طیبہ میں رہتا ہے اب رنجیدہ رنجیدہ

فاصلوں کو تکلف ہے ہم سے اگر، ہم بھی بے بس نہیں، بے سہارا نہیں
خود انھی کو پکاریں گے ہم دور سے، راستے میں اگر پاؤں تھک جائیں گے

ہم مدینے میں تنہا نکل جائیں گے اور گلیوں میں قصدا بھٹک جائیں گے
ہم وہاں جا کے واپس نہیں آئیں گے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے لوگ تھک جائیں گے
جیسے ہی سبز گنبد نظر آئے گا، بندگی کا قرینہ بدل جائے گا
سر جھکانے کی فرصت ملے گی کسے، خود ہی پلکوں سے سجدے ٹپک جائیں گے
نامِ آقا جہاں بھی لیا جائے گا، ذکر ان کا جہاں بھی کیا جائے گا
نور ہی نور سینوں میں بھر جائے گا، ساری محفل میں جلوے لپک جائیں گے
اے مدینے کے زائر خدا کے لیے، داستانِ سفر مجھ کو یوں مت سنا
بات بڑھ جائے گی، دل تڑپ جائے گا، میرے محتاط آنسو چھلک جائیں گے
ان کی چشمِ کرم کو ہے اس کی خبر، کس مسافر کو ہے کتنا شوقِ سفر
ہم کو اقبالؔ جب بھی اجازت ملی، ہم بھی آقا کے دربار تک جائیں گے

مظفروارثی

نام محمد مظفر الدین احمد صدیقی اور تخلص مظفر ہے۔ ۲۳/ دسمبر ۱۹۳۳ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان آگئے اور لاہور میں بود و باش اختیار کی۔ بہترین نعت گو کا ایوارڈ پاکستان ٹیلی وژن سے ۱۹۸۰ء میں حاصل کیا۔ غالب اکیڈمی دہلی کی جانب سے بہترین شاعر کا ''افتخارِ غالب'' ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ آپ ان خوش قسمت عشاقانِ نبی ﷺ میں سے ہیں کہ جنھیں نعت گوئی کی ساتھ ساتھ ایک مسحور کن آواز اور دل نشین انداز بھی عطا ہوا۔ کافی عرصہ علیل رہنے کے بعد ۲۸ جنوری ۲۰۱۱ء کو ۷۷ برس کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گئے۔ آپ اردو شاعری کی تاریخ کا اہم ستون اور عہد حاضر

میں اردو نعت کا انتہائی معتبر نام ہیں، تاہم آپ نے ہر صنفِ شعر غزل، نظم، حمد، نعت و سلام، گیت، قطعات اور ہائیکو وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کی شاعری اپنے منفرد اسلوب اور موضوعات کے تنوع کے باعث پیش منظر کے شاعروں کے لیے بڑا چیلنج ہے۔ اردو کے نامور شاعر جناب احسان دانش نے لکھا تھا: ''نئی طرز کے لکھنے والوں میں جدید غزل کا معیار مظفر وارثی کی غزل سے قائم ہوتا ہے''۔ ان کی مشہور ترین نعت ''میرا پیمبر عظیم تر ہے'' زبان زد عام ہے۔

یا رحمتہ اللعالمین
الہام جامہ ہے تیرا
قرآن عمامہ ہے تیرا
منبر تیرا عرشِ بریں
یا رحمتہ اللعالمین

قبضہ تیری پرچھائیں کا
بینائی پر ادراک پر
پیروں کی جنبش خاک پر
اور آہٹیں افلاک پر
گردِ سفر تاروں کی ضَو
مرکب بُراقِ تیز رَو
سائیس جبرئیلِ امیں
یا رحمتہ اللعالمین
پھر گڈریوں کو لعل دے
جاں پتھروں میں ڈال دے

حاوی ہوں مستقبل پہ ہم
ماضی سا ہم کو حال دے
دعویٰ ہے تیری چاہ کا
اس اُمتِ گُم راہ کا
تیرے سوا کوئی نہیں
یا رحمتہ اللعالمین

مرا پیمبر عظیم تر ہے
کمالِ خلاق ذات اُس کی
جمالِ ہستی حیات اُس کی
بشر نہیں عظمتِ بشر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

وہ شرحِ احکام حق تعالیٰ
وہ خود ہی قانون خود حوالہ
وہ خود ہی قرآن خود ہی قاری
وہ آپ مہتاب، آپ ہالہ
وہ عکس بھی اور آئینہ بھی
وہ نقطہ بھی، خط بھی، دائرہ بھی
وہ خود نظارہ ہے، خود نظر ہے

مرا پیمبر عظیم تر ہے

وہ آدم و نوح سے زیادہ
بلند ہمت بلند ارادہ
وہ زُہدِ عیسیٰ سے کوسوں آ گے
جو سب کی منزل وہ اس کا جادہ
ہر اک پیمبر نہاں ہے اس میں
ہجومِ پیغمبراں ہے اس میں
وہ جس طرف ہے خدا ادھر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

بس ایک مشکیزہ اک چٹائی
ذرا سی جَو،ایک چارپائی
بدن پہ کپڑے بھی واجبی سے
نہ خوش لباسی نہ خوش قبائی
یہی ہے کُل کائنات جس کی
گنی نہ جائیں صفات جس کی
وہی تو سلطانِ بحرو بر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

جو اپنا دامن لہو سے بھر لے
مصیبتیں اپنی جان پر لے
جو تیغ زن سے لڑے نہتا
جو غالب آ کر بھی صلح کر لے
اسیر دشمن کی چاہ میں بھی
مخالفوں کی نگاہ میں بھی
امیں ہے، صادق ہے، معتبر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

*****

ڈاکٹر محمد رشید ارشد
مدیر غزالی فورم

در جہانی و از جہاں بیشی

نبی اکرم ﷺ کی شانِ مبارک کی بابت جو کچھ بھی عرض کیا جائے گا آپ ﷺ ہمیشہ اس سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ ہمارے استاذ کہا کرتے ہیں کہ فارسی نعت کی روایت کا سب سے بڑا شعر انوری کا ہے:

در جہانی و از جہاں بیشی
ہمچو معنی کہ در بیاں باشد

یعنی آپ ﷺ اس دنیا میں ہیں لیکن اس دنیا سے زیادہ ہیں، جیسے معنی بیان میں ہوتا ہے لیکن وہ بیان سے زیادہ ہوتا ہے۔ ہم ایسے بے بضاعت نبی کریم ﷺ کی شان کیا بیان کریں گے:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

یا جو غالب نے کہا کہ:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم

تو کیوں نہ رسول کریم ﷺ کا وہ تعارف بیان کیا جائے جو رب کریم نے کرایا ہے اور یہ سب سے بڑا تعارف ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ﴿واعلموا أن فیکم رسول اللہ﴾۔

تفہیمِ مدعا کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ والا صفات دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک آپ ﷺ کا اپنے خالق و مالک و محبوبِ حقیقی یعنی اللہ تعالی سے تعلق جس کو ہم اختصار سے تعلق مع الحق کہہ سکتے ہیں اور دوسرا ماسوا اللہ سے

تعلق جس کو ہم تعلق مع الخلق کا عنوان دے سکتے ہیں۔ یہ دو پہلو ہوئے آپ ﷺ کی شخصیت کے، لیکن ایک تیسری جہت بھی قائم کی جا سکتی ہے یہ ذات حق اور اس کی خلق کے درمیان ربط و رابطے کی جہت ہے۔ جب تک رسول اللہ ﷺ کی ان سبھی جہات کا صحیح ادراک حاصل نہ ہو آپ ﷺ کا تعارف ناقص رہ جائے گا۔

تعلق مع الحق کے حوالے سے دیکھا جائے تو آپ ﷺ عبدِ کامل تھے، آپ کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف اس کی عبدیتِ کاملہ تھی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ہم سے خوش گفتاریاں فرما رہے ہوتے تھے کہ اذان کی آواز آپ کے گوشِ مبارک میں پڑتی تو آپ ہمیں یوں چھوڑ کر اٹھ جاتے گویا آپ ہمیں جانتے ہی نہیں۔ یا آپ کا سیدہ سے یہ فرمانا کہ "ہٹ جاؤ! مجھے اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے دو"۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ آپ کی بعثت کے اساسی مقاصد میں اظہارِ دین شامل تھا اور اس کے لیے آپ ﷺ نے جاں گسل محنت کی لیکن اگر پوچھا جائے کہ آپ ﷺ کا اپنا رجحان کس طرف تھا تو وہ یقیناً تبتل الی اللہ ہی کی طرف تھا۔ اسی لیے قرآن میں حق تعالی نے ان سے فرمایا: ﴿إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا﴾ "بے شک دن میں آپ کے لیے ایک طویل شغل ہے"۔

تعلق مع الخلق کے حوالے سے دیکھیں تو رسول اللہ ﷺ کی آمدِ مبارک سے جو شرف انسانیت کو حاصل ہوا اور جو فیض پورے عالم نے آپ ﷺ سے حاصل کیا وہ لافانی ہے۔ اس کے بارے میں اقبال نے بہت صحیح کہا:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو　　زاں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفی او را بہاست　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفی است

تو آپ ﷺ لوگوں کے لیے باعث نفع بنے اور بنے رہیں گے لیکن آپ کی اس شان کو باقی شانوں پر غالب قرار دے دینا ایک دوسری بات ہے۔

دورِ استعمار میں جہاں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کو نشانے پر لیا اس کے نتیجے میں بہت سے اسلامی مفکرین نے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا۔ اسی سلسلے میں سیرت نگاری کا بھی ایک نیا اسلوب اختیار کیا گیا جس میں Humanization of the Prophet ایک اہم عنصر تھا۔ کوشش کی گئی کہ پیغمبر کی شخصیت اور ان کی حیاتِ مبارکہ کو

خالص انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا اور دکھایا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی بشریت اور افادیت کے پہلو کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا گیا۔ محمد حسن عسکری کے الفاظ میں: ''لیکن اب سر سید کے زیرِ اثر اور پیرویِ مغرب کے شوق میں لارڈ میکالے کے عقیدت مند ابھرنے لگے تھے جو کہتے تھے کہ اسلام افضل ترین مذہب ہے کیونکہ یہ مذہب ہے ہی نہیں بلکہ دنیاوی زندگی بسر کرنے کا ایک سیدھا سادہ راستہ ہے اور آنحضرت محض پیغمبر نہیں بلکہ 'مصلح' اور 'ریفارمر' ہیں''۔

ترازو کا جھکا ہوا پلڑا، دوسرے پلڑے کو ہلکا کر کے اٹھا بھی تو دیتا ہے۔ پس اس عدم اعتدال کی زد، شخصیت محمدی علی صاحبہا الصلوۃ و السلام کی اس جہت پر پڑی جسے ہم نے خالق و مخلوق کے درمیان رابطے کا نام دیا تھا۔ جو اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملانے کا کام تھا جسے کار نبوت و رسالت کہا جا سکتا ہے۔ تو یہ پہلو کچھ دب سا گیا تو محسوس ہوتا ہے کہ کچھ اس حوالے سے ضرور لکھا جائے۔ ذات رسول ﷺ کے افادی پہلو یا زیادہ واضح الفاظ میں کہیں تو مادی افادیت کے پہلو سے ذرا بچ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ ذات رسول ﷺ کے ایمانی ثمرات کیا ہیں۔ ایمان بالرسالت کس طرح میرے ایمان باری تعالی میں اضافے و تکمیل کا باعث بنتا ہے۔

ایمان بالرسالت کے قانونی اور اعتقادی پہلو واضح ہیں لیکن اس کی ایک حکیمانہ جہت بھی ہے جسے پیش نظر رہنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ پر ہمارا ایمان غیب کو واجب الاثبات بنانے والی سب سے بڑی قوت ہے اس ایمان کی مدد سے ہمارے تمام عقائد میں ایک زندہ تیقن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس حجت کو قائم فرمانے آئے تھے وہ حجت اپنے دو مظاہر رکھتی ہے: قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ۔ قرآن؛ ایمان کی حقیقت کو ذہن اور ارادے پر حتماً غالب کر دیتا ہے اور ذاتِ رسول اللہ ﷺ آدمی کی طبیعت میں اس کا استحضار پیدا کر دیتی ہے۔ گویا آپ ﷺ محض حجت لے کر ہی نہیں آئے تھے بلکہ اللہ نے آپ ﷺ کو حجت بنا کر بھی بھیجا تھا۔

عقائد کا جو بھی کلی بیان اور اس کا فہم قرآن سے میسر آتا ہے، رسول اللہ ﷺ سے تعلق اس فہم کے ہر جز کو ہمارے نفس میں اسی زندگی کے ساتھ حاضر کر دیتا ہے جس سے غیب کے حدود بھی نہیں ٹوٹتے اور وہ حضور بھی قائم ہو جاتا ہے جو ایمان بالغیب کے مدارِ یقین بن جانے کی بنیادی ضرورت ہے۔ ایمان جس غیر متزلزل یقین کا تقاضا کرتا ہے اس یقین کو

ہمارا شعور اپنی کسی بھی صلاحیت اور قوت سے حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ اپنی نارسائی کا اعتراف تو دور کی بات اپنی نارسائی پر قانع بھی نہیں رہ سکتا' شعور چونکہ ایک تحکمانہ قسم کی واقفیت اور تیقن کا عادی ہے جو اسے تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتا رہتا ہے تو غیب اگر اسے بتا بھی دیا جائے تو یہ غیب اس کے دلائل کا منتہا تو ہو سکتا ہے مگر اسے یقین کے موقف پر اس طرح استوار نہیں کر سکتا جس طرح کے تیقن سے یہ مانوس ہے۔

عقل تصور سازی میں چاہے کتنا بھی انہماک رکھے اس کے تصورات اس کی تسکین نہیں کر سکتے۔ یقین کی ہر قسم میں شعور کی وہ تسکین ناگزیر ہے جو تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ شعور، غیب اور امور غیب کے مشاہدے اور تجربے سے محروم ہے۔

اور اپنی ساخت کے اعتبار سے وہ ان دونوں کی ضرورت کو محسوس بھی کرتا ہے تو اب حل کیا ہو سکتا ہے مگر یہی کہ شعور کو ایک ایسی ہستی سے متعارف کرایا جائے جو ایک طرف اس کے مشاہدے و تجربے کے دائرے میں آتی ہو اور دوسری طرف اس ہستی کو غیب کا تجربہ و مشاہدہ بھی حاصل ہو تاکہ شعور بالواسطہ سہی لیکن غیب کو اپنے لیے مشاہدہ بنا کر اپنے یقین کو برقرار رکھ سکے۔

رسالت کی ایمانی اہمیت یہ ہے کہ یہ شعور کو اس دو طرفہ شہود تک پہنچا دیتی ہے جس کا ایک سرا یہاں ہے اور دوسرا غیب میں اور یہ دونوں سرے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں... ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل۔ جیسے ایک بے کنار سمندر کا ساحل اس کے ان دیکھے کناروں پر بھی یقین پیدا کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ غیبِ مطلق کو ماننے کا خدائی تقاضا پورا ہی نہیں ہو سکتا جب تک رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے دونوں اصول یعنی انسانیت اور رسالت سے مومنانہ نسبت نہ پیدا کی جائے۔ آپ ﷺ کی یہ دونوں جہتیں ایک دوسرے میں اپنے اپنے کمالات کے ساتھ مدغم ہیں اور یہی ادغامِ غیب کو شہود کی طرح موجب یقین بناتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی مبارک شخصیت کی یہ دو جہتیں ایک دوسرے میں مدغم کیسے ہیں اس کی کچھ تفصیل یہ ہے: رسول اللہ ﷺ کی رسالت ہو یا بشریت دونوں کا قوام ایک ہی ہے، یعنی رسالت کے کمالات عین بشریت کے کمالات ہیں اور آپ ﷺ کی بشریت کے مراتب رسالت کے مقامات سے اس

طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے دو متحد المعانی الفاظ؛ یعنی لفظ ایک دوسرے سے ممتاز ہونے کے باوجود معنوی اتحاد رکھتے ہیں اور ان پر آخری حکم اتحاد کا لگایا جائے گا نہ کہ امتیاز کا۔ جس طرح ہم جانتے ہیں کہ نبی جس سلسلۂ معجزات کو لے کر آتا ہے اس میں پہلا معجزہ وہ خود ہوتا ہے۔ یہ الٰہی معجزہ عصمت کی شکل میں ظہور کرتا ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ میں رسالت اور بشریت کا منتہائی اتحاد؛ نقطۂ عصمت پر واقع ہوتا ہے۔ یہ عصمت اس کی بشریت کو بھی حاصل ہے اور رسالت کو تو خیر ہے ہی۔ عصمت، اللہ کی مستقل اور کلی حفاظت کا نام ہے۔ اس حفاظت کے دو پہلو ہیں: شر سے حفاظت اور نقص سے حفاظت۔ شر اخلاقی ہے اور نقص وجودی۔ نبی؛ کامل الاخلاق تو ہوتا ہی ہے، کامل الوجود بھی ہوتا ہے۔

اللہ کا یہ مستقل حفاظتی نظام جسمانیات کے دائرے میں نہیں ہے، مثلاً یہ کہ بیماری اور تکلیف وغیرہ نہ آئے۔ عصمت کا حقیقی جوہر یہ ہے کہ بندے کا مظہرِ حق ہونا کسی بھی پہلو سے مجروح نہ ہو یا ادھورا نہ رہ جائے۔ اور یہ ممکن نہیں کہ حق کی مظہریت پر فائز بندہ اپنی ایک جہت سے مظہرِ حق ہو اور دوسری جہت سے نہ ہو۔ سو رسول اللہ ﷺ کی شانِ کمال یعنی حق کی آخری اور اکمل مظہریت جہت رسالت سے بھی ظاہر ہے اور جہت بشریت سے بھی واضح ہے۔ آپ ﷺ سے ایمان کی حالت میں انسانوں میں پائے جانے والے تعلق کی کیفیت کے ساتھ متعلق ہو جانا آپ ﷺ کی رسالت کے محتوی کا بھی حضور پیدا کر دیتا ہے۔

دین ایک اندازِ بیان کی رو سے حکم اور تعمیل کا ایک مکمل سلسلہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس اس سلسلے کا ایک فعال اظہار ہے جو آپ ﷺ کے ماننے والوں میں غیب سے وابستگی کی طبعی مناسبت پیدا کر دیتا ہے، یعنی حکم کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اور تعمیل کا عالمِ شہود سے۔ رسول اللہ ﷺ سے اظہار پانے والی تعمیل کی صورتیں ایمان کی آنکھ سے مشہود ہو کر حکم سے بھی زندہ تعلق پیدا کر دیتی ہیں جو ایمان کے یقین بننے کا سب سے طاقتور ذریعہ ہے۔ ہم دیکھتے نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات میں حکم کا محفوظ ہونا اور تعمیل کا کامل ہونا ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے فاصلے کو ختم کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ سے عبودیت کے منتہا کا اظہار تو ہوتا ہی ہے معبودیت کا بھی مکمل تعارف ہو جاتا ہے۔ اس طرح

آپ کو ماننے والا بندگی کے ہر مرحلے پر معبودیت کی ایک شان کا ادراک اور تجربہ کرلیتا ہے۔ غیب سے شعور کو متعلق کرنے اور رکھنے کا اس کے علاوہ کوئی انداز فرض بھی نہیں کیا جاسکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی معرفت کا جو کمال سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہ کے قول میں نظر آتا ہے وہ قرآن کے باہر کہیں نہیں پایا جاتا: ﴿کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ﴾ یعنی آپ ﷺ کے اخلاق کی اصل اور تفسیر قرآن ہے۔ اپنی معنویت میں یہ جملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ اخلاقِ رسول کا قرآن ہونا اس حقیقت پر کامل ترین دلالت رکھتا ہے کہ آپ ﷺ میں بشریت اور رسالت متحد الاصل ہیں۔ اس قولِ مبارک کا ممکن حد تک مکمل مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ قرآن کے بنے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کو کسی ایک پہلو سے جاننا دوسرے نامعلوم پہلوؤں کا یقین بھی فراہم کر دیتا ہے۔ یعنی آپ ﷺ کی شخصیت کی شان؛ شہودِ رسالت کے جوہرِ غیب پر گویا حسی دلالت کرتی ہے۔ اسی کو ہم اس بات سے تعبیر کر رہے ہیں کہ ایمان بالغیب میں یقین کی کیفیت کا حصول ایمان بالرسول کے بغیر محال ہے۔

خوش رہیں تیرے دیکھنے والے
ورنہ کس نے خدا کو دیکھا ہے

ایمان کا سب سے پہلا لازمہ اطاعت ہے۔ ایمان کا فطری تقاضا اور اوّلین مطالبہ اگر غور کیا جائے تو اطاعت ہی ہے۔ ایمان باللہ ہو یا ایمان بالرسول دونوں پہلے عزمِ اطاعت کو تحریک دیتے ہیں اور پھر یہی عزم جذبۂ محبت میں منقلب ہو جاتا ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ ایمان انسان کی اصل حقیقت یعنی بندگی کو اپنا موضوع بناتا ہے اور اس کی تصحیح اور تکمیل کا واحد سبب بنتا ہے۔ بندگی بالقوۃ کو عمل میں لانے کے لیے پہلے تصحیح درکار ہے اور پھر تکمیل۔ اطاعت اسی تصحیح کو بالفعل ممکن بناتی ہے اور محبت اس کی بنیاد پر بندگی کی تکمیل کرتی ہے، گویا اطاعت صحتِ بندگی ہے اور محبت کمال بندگی۔ تاہم اس اصول میں کچھ ایسی باریکیاں بھی ہیں جنھیں سمجھ لینا ضروری ہے:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اللہ کا مطاع ہونا اس کی حاکمیت کے ساتھ معبودیت کو بھی شامل ہے، لہٰذا اللہ کی اطاعت میں اس کی عبادت بھی داخل ہے۔ اسی فقرے کو یوں بھی کہا جائے تو درست ہوگا کہ اللہ کی عبادت میں اس کی اطاعت بھی

موجود ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ انسانی ادراک میں یہ دونوں تصورات یکساں شدت کے ساتھ موجود ہیں کہ معبودیت کو اللہ کی ذات کے ساتھ زیادہ قریبی اور قوی نسبت حاصل ہے جبکہ دوسرا تخیل یہ ہے کہ حاکمیت اقرب الی الذات ہے۔ ان دونوں تصورات میں فرق صحیح اور غلط کا نہیں بلکہ مزاجِ بندگی کا ہے اور یہ اختلاف عقلی طور پر کسی تضاد کا حامل نہیں ہے اور فطری طور پر تو بالکل ہی حقیقی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں بھی دو باتیں ہیں۔ ان کو یوں سمجھنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کا مطاع ہونا ایک تو شارع کی حیثیت سے ہے اور دوسرے نمونۂ کمال کی حیثیت سے۔ اس میں بھی ترجیحات کا ذوقی اختلاف ہو سکتا ہے۔ کوئی محض احکام تک محدود رہ کر مطمئن ہے اور کوئی رسول اللہ ﷺ کے نمونۂ کمال ہونے کی تمام تفصیلات کو مقصود بنا کر ان کے ایک ایک جز کی پیروی کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنت کے موضوع پر بہت سے اختلاف شروع سے چلے آ رہے ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ کی مطاعیت کے اجزا کی فہرست میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ تو اب اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس اختلاف کی بنیاد پر اطاعتِ رسول ہی کو تفصیلات میں غیر محکم اور مخدوش قرار دے دیا جائے۔ اس طرح تو اللہ کی اطاعت بھی لپیٹ میں آ جائے گی، کیونکہ اس کے مظاہر کا تعین بھی تقریبًا محال ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض لوگ اطاعت کو حکم کے مطابق رکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے حضرات اس معاملے میں اس ذوق کو فیصلہ کن حد تک دخیل رکھنا چاہتے ہیں جو حکم کے خلاف نہیں مگر حکم تک محدود بھی نہیں ہے۔ اس بات کو ہم آگے چل کر کھولیں گے کہ ذوق کا علم کے مطابق ہوتے ہوئے بھی اس تک محدود نہ رہنے کا کیا مطلب ہے۔ اس وقت سمجھنے کی چیز یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت دراصل مجاز ہے اللہ کی اطاعت کا۔ اس وجہ سے ان دونوں اطاعتوں سے بننے والا ماحول اپنے جوہر میں یکساں ہونے کے باوجود اپنی تفصیل میں ایک نہیں ہوتا۔ اللہ کو خالق، حاکم اور معبود ماننا اس کی اطاعت کی شرائط میں سے ہے۔ اللہ کی ان حیثیتوں کا مستقل استحضار ہی اس کی اطاعت کو ممکن بناتا ہے اور یوں بھی نفسِ اطاعت اپنی ماہیت میں مطاع کے لیے بہر پہلو، الٰہ ہونے کا تقاضا رکھتی ہے اور اس تقاضے کی تسکین کے بغیر اطاعت کا صدور و ظہور محال ہے۔ ورنہ دین کے مطلوبات اطاعتِ رسول سے اعلیٰ درجے میں پورے ہو جاتے ہیں مگر ایک چیز رہ جاتی ہے اور وہ ہے مطاعِ مطلق کی

معبودیت کا یقین جس کے بغیر اطاعت کا فطری داعیہ اور استعداد حرکت میں نہیں آ سکتی تھی۔ اطاعت اپنے منتہا پر جذبۂ عبادت ہی کا دوسرا نام ہے۔ اگر ہم کچھ فطری حقائق کا تجزیہ کریں تو ان شاء اللہ یہ واضح ہو کر سامنے آجائے گا کہ اللہ کا مطاع ہونا فطرتِ بندگی میں اس کی معبودیت کے خلقی شعور ہی سے متحقق ہوتا ہے۔

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذات بندگی کے ان فطری اساسات کی صحیح پرداخت اور درست تکمیل کے لیے مطاعیت کے درجے پر رکھی گئی ہے۔ آپ ہی کی بدولت اقتضاے بندگی اپنی تکمیل اور تصحیح کے یقینی ذرائع حاصل کرتا ہے۔ آپ درمیان سے ہٹ جائیں تو خود اللہ ایک مفروضہ ہے اس کا مطاع وغیرہ ہونا تو ثانوی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وحی پر ہمارا ایمانی اعتماد اس وقت تک محض ایک تصور ہے جب تک صاحب وحی اس تصور کے مقابل میں تصدیق بن کر سامنے نہ آئیں، یعنی خبر پر اعتماد دراصل خبر دینے والے پر اعتماد کا نام ہے۔ اسی طرح حق سے نسبت دراصل حق کو لانے والے کے ساتھ تعلق پر منحصر ہے۔ رسالت بیچ میں سے ہٹ جائے تو بندگی اور معبودیت کے تعلق کی ہر صورت محال ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ تصحیح بندگی کے موقف پر کھڑے ہو کر اطاعت کا رنگ قانونی ہوگا اور یہ بہت ضروری ہے بلکہ اطاعت کے تمام اجزا کا دار و مدار ہی اطاعت کی قانونی اساس پر ہے تاہم اس سے اطاعت کے ضروری عملی حدود تو متعیّن ہو جاتے ہیں مگر ذوقِ اطاعت اور استعداد تعلق کا احاطہ نہیں ہوتا۔ یہ احاطہ اسی وقت ہوگا جب فرائض نوافل کے محرک بنیں گے اور اطاعت رسول؛ اتباعِ رسول پر غلبے کے ساتھ مائل کرے گی۔

اس مبحث میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے حوالے سے اگر غور کریں تو یہی بات ٹھیک ہے کہ اللہ کی محبت ہمیشہ اللہ کی اطاعت کا ثمر ہوگی لیکن رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے معاملے میں یہ شرط کہیں کہیں اٹھ بھی جاتی ہے۔ یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اطاعت فی الواقع آپ کی محبت کا نتیجہ ہے۔ اس فرق کی ایک وجہ یہ ہے کہ کمالِ بندگی کا کوئی مرتبہ بھی صحتِ بندگی کی پختہ تحصیل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا جبکہ نفس کی صلاحیتِ تعلق کا حال یہ ہے کہ یہ اپنی استعدادِ اطاعت کی پوری کمک کے بغیر بروئے کار آ سکتی ہے۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نفسِ بندگی کی صلاحیتِ تعلق کا مقصود ہیں اور اللہ اس

کی استعدادِ اطاعت وعبادت کا، جس کی کارفرمائی کا انداز؛ صلاحیتِ تعلق سے مختلف ہے۔ مختصر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا مطاع ہونا فی الحقیقت اطاعتِ الٰہیہ کا واحد ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے آپ کی اطاعت اپنی جگہ مقصود ہوگئی ہے۔

اطاعت کے بیان کے بعد اتباع کے بارے میں بھی کچھ اصولی باتیں عرض کی جاتی ہیں۔ اتباع کے سلسلے میں پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کسی عمل یا خیال کی نہیں ہوتی بلکہ شخصیت کی ہوتی ہے۔ جیسے اطاعت کا مقصود تعمیلِ امر ہے لیکن اتباع کا مطلوب متبوع کی پوری شخصیت کا رنگ اختیار کرنا ہے اور اس کا مزاج قانونی نہیں ہوتا یعنی یہ عمل کسی کام کی انجام دہی یا کسی حکم کی بجاآوری کی کیفیت نہیں رکھتا بلکہ اس کے پیچھے نفس کا بنیادی داعیہ یہ ہوتا ہے کہ اس مجموعی کمال تک پہنچا جائے جو متبوع کی ذات میں خاصے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے تمام رویوں اور اعمال سے منعکس ہوتا رہتا ہے۔ اتباع لگ کر چلنے کو کہتے ہیں یا قدم؛ قدم پر رکھنے کا عمل اتباع ہے۔ اس کا محرک اطاعت سے زیادہ وہ جذبۂ محبت ہوتا ہے جو آدمی کو اپنے متبوع سے تعلق کے دائرے میں سمائے رہنے پر مائل کرتا ہے۔ اطاعت اور اتباع واحد الاصل ہیں، کیونکہ مطاع اور متبوع ایک ہی ذات ہے۔ ان میں کچھ امتیازات یقیناً ہیں مگر وہ اسی طرح کے ہیں جیسے کہ ایک کل کے دو اجزا وحدت پر قائم ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے سے ممتاز بھی ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی اپنے کل کے ساتھ نسبت کا مزاج اور معنویت دوسرے سے منفرد ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے تعلق کو اگر ہم کل تصور کر لیں تو اطاعت اور اتباع کل کے وہ ایسے دو لازمی اجزا ہیں جن میں سے ایک بھی کم ہو جائے تو تعلق کا کل ناقص رہ جائے گا۔

ان دونوں لازمی اجزا کی اپنے کل کے ساتھ نسبت کی کیفیت میں جو امتیازات ہیں ان میں سے کچھ ہم ابھی بیان کریں گے اور اسی طرح معنوی سطح پر بھی ان اجزا کا اپنے کل کے ساتھ تعلق کہاں کہاں منفرد ہے اس پر بھی نظر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ پہلے مزاج یا کیفیت کو لے لیتے ہیں۔ مزاج سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس جز کی اندرونی بناوٹ اور اس کا اندازِ حرکت کیا ہے اور اس جز کی کارفرمائی بعض احوال کی حامل ہے اور بعض کی بانی۔ ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ وہ احوال کیا ہیں؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا شاید زیادہ قابل فہم ہو کہ اطاعت اور اتباع کی تحریک اور تاثیر میں کچھ بنیادی امتیازات ہیں جن میں سے چند کا تعلق نفس سے ہے اور بعض کی نسبت خود اس پیغام کی طرف ہے جس کی اساس پر یہ دونوں قوتیں

اپنے مقصود کا تعین کر کے عمل میں آتی ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو اطاعت اور اتباع میں مزاجی اور تاثیری امتیازات یہ ہیں:

۱ اطاعت کا اولین محرک خوف ہے جبکہ اتباع کا محبت۔

۲ اطاعت کا مقصود سزا سے بچنا ہے، اتباع کا مقصود رضا کا حصول ہے۔

۳ اطاعت کی بنیادی قوت ارادے سے فراہم ہوتی ہے جبکہ اتباع کی اصل طاقت طبیعت سے میسر آتی ہے اور ایک نوع کے حال پر ختم ہوتی ہے۔

۴ اطاعت میں ہمہ وقت مستحضر رہنے والا تسلسل محال ہے جبکہ اتباع میں ممکن ہے۔

۵ اطاعت امر میں ہوتی ہے جبکہ اتباع ذات میں ہوتی ہے۔

۶ اطاعت اپنے مزاج میں بندگی پر عملی استقامت اور ارادی استحکام کا نام ہے جبکہ اتباع بندگی میں مسلسل ترقی کرنے کا عمل ہے۔

۷ اطاعت میں مطاع کا حضور نہ ہونا کسی نقص پر دلالت نہیں کرتا جبکہ اتباع میں متبوع کا حضور شرط لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔

۸ اطاعت میں ایک نوع کی انتخابی حس بہت قوت سے برسرِکار رہتی ہے جبکہ اتباع کا مزاج انتخابی اور جزوی نہیں ہوتا بلکہ عمومی اور مجموعی ہوتا ہے، یعنی اطاعت میں احکام کی درجہ بندی اور ترجیحات کا عمل نہ ہو تو اس کی بجاآوری مشکل ہوجاتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف اتباع میں درجہ بندی اور ترجیحات داخل ہوجائیں تو اس میں نقص واقع ہوجاتا ہے۔

۹ اطاعت کچھ کرنا ہے جبکہ اتباع کچھ بننا ہے۔ دین ایک جہت سے جس احکامی structure کا نام ہے اس سے کچھ مخصوص اعمال ہی نہیں پیدا ہوتے بلکہ اخلاق کی بنیاد بھی پڑتی ہے۔ اللہ کے ہر حکم میں یہ مطالبہ پایا جاتا ہے کہ اس کی تعمیل کو عمل اور اخلاق دونوں میں جاری کرو، تو حکم کی تعمیل عمل میں ہو تو اطاعت اور اخلاق میں ہو تو اتباع۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے حوالے سے بھی عین یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہم بندگی کے مستقل حدود میں رہنے کی قوت اطاعت

سے حاصل کرتے ہیں اور بندگی کی اخلاقی بناوٹ کے قیام اور اس کی تکمیل کی تمام صورتیں آپ ﷺ کے اس مزاجِ عبودیت سے اخذ کرتے ہیں جو آپ ﷺ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے یکساں کمال کے ساتھ ظاہر ہے۔ مراد یہ کہ آپ ﷺ کی جہتِ رسالت ہو یا جہتِ بشریت دونوں ایک ہی طرح کے کمالات سے کامل ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیے کہ آپ کو نماز بھی مرغوب تھی اور ٹھنڈا پانی بھی۔ ان دونوں میں مادۂ رغبت ایک ہے۔ اتباع کے بغیر آدمی رسول اللہ ﷺ کے اس کمالِ حقیقی سے زندہ تعلق نہیں پیدا کر سکتا جس کا ظہور آپ کی شخصیت کے تمام اجزا میں مشترک ہے۔

۱۰ بندگی مثال کے طور پر عاجزی کا نام ہے اور اس عاجزی کا اظہار اطاعت اور اتباع میں منقسم ہے۔ فرق یہ ہے کہ عاجزی کا جو شعور اطاعت کے پیچھے کارفرما ہے وہ اس شعور سے مختلف ہے جو اتباع کی بنیاد بنتا ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اطاعت میں عاجزی کا تصور پایا جاتا ہے کہ بندہ اپنی فلاح کا سامان خود سے نہیں کر سکتا۔ یہاں عاجزی کی نوعیت عقلی اور عملی ہے جبکہ اتباع میں عاجزی کی نوعیت روحانی اور وجودی ہے۔ اطاعت کا کوئی بھی تصور عاجزی میں ناگواری کے عنصر کو زائل نہیں کرتا جبکہ بندگی کی بنیادی ضرورت کے طور پر سامنے رہتی ہے اور بندہ اس میں مزید اضافے کا خواہش مند رہتا ہے۔ اطاعت بندے کو عاجزی کے ایک دائرے میں رکھتی ہے جبکہ اتباع میں اس کے نئے نئے دائرے بنتے اور عبور ہوتے چلے جاتے ہیں، گویا بندگی یہی ہے کہ عاجزی کو ایک سطح پر زائل کیا جائے اور دوسری سطح پر محفوظ رکھا جائے۔

۱۱ اطاعت سے جبر منہا نہیں ہو سکتا اور اتباع میں جبر داخل نہیں ہو سکتا۔

۱۲ اطاعت سے احکام کا تاریخی تسلسل اور تعمیل کے عملی حدود کی حفاظت ہوتی رہتی ہے جبکہ اتباع میں بندگی کے بنیادی احوال اور اس کے مجموعی مزاج کی تشکیل ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا متبوع ہونا آپ سے محبت کی نسبت پر استوار ہے۔ جہاں تعلق میں کوئی شرط نہ پائی جائے یعنی مطاع کا مطاع ہونا بھی مطلق ہو اور مطیع کا مطیع ہونا بھی مستقل ہو۔ ایسے تعلق میں محبت کا مطلب دیگر تعلقات میں کارفرما محبت سے مختلف ہو جاتا ہے۔ محبت بہرحال ایک جذبۂ فنا ہے۔ ہدایت کے ان قطبین کے تعلق میں طلب کی جانے والی محبت کا لازمی تقاضا ہے کہ اُمتی اپنے رسول کے ساتھ نثار ہو جانے والے جذبے سے متعلق رہے۔ یعنی یہ محبت مسلسل اکساتی رہے

کہ ہم خود سے خالی ہوکر رسول اللہ ﷺ کے تعلق سے بھر جائیں۔ اتباع کی اصل غایت یہی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی معلوم شخصیت کو اپنے وجود کی تشکیل نو کا واحد ماخذ بنائیں۔ یہی کمالِ بندگی کا منتہا ہے اور اس کی طرف لپکنے کا مزاج پیدا کیے بغیر عبودیت میں سچائی کی اصل ایسی مجروح ہوجاتی ہے کہ پھر تعمیل کی قانونی قوت بھی اس کا ازالہ نہیں کرسکتی۔ ازالہ تو دور کی بات ہے خود وہ قوت مطلوبہ معیار پر آنے کے قابل نہیں رہتی۔

اس پس منظر میں دیکھیں تو بالکل واضح ہوجائے گا کہ آپ کے مزاجِ مبارک یعنی اخلاق و خصائص کی مستقل قبولیت اور ان کی طرف اٹل رغبت رکھے بغیر ہم اپنے اندر انسانیت کا وہ جوہر پیدا ہی نہیں کرسکتے جو حق کی قبولیت اور اس قبولیت پر ثابت قدم رہنے کے لیے لازماً درکار ہے۔ حق پرستی، صداقت، نیکی وغیرہ کی جڑ اگر طبیعت میں محکم نہ ہو تو ان کا زیادہ اعتبار نہیں ہے۔ اسی طرح احکام کی تعمیل اگر اقتضائے بندگی نہ بنے تو اس پر بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اتباع جو حق کے ذوق اور قدر شناسی سے کی جاتی ہے دراصل ہمیں حق کے ساتھ وابستگی میں سچا، مخلص اور بے نفس بناتی ہے۔ مجھ سے پوچھا جائے تو میں تو کم از کم یہی کہوں گا کہ رسول اللہ ﷺ کے معاملے میں محبت کو اطاعت پر اولیت حاصل ہے۔ آپ ﷺ کے حقوق محبت سے شروع ہوتے ہیں اور اطاعت سے تصدیق پاکر اسی محبت پر تمام ہوتے ہیں۔

اتباع کے معاملے میں افراط و تفریط بھی پائی جاتی ہے جو اکثر موقعوں پر خلافِ سنت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے کئی مواقع پر اپنے کسی خاص معمول کی نقل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ایسی چیزوں کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ اتباع کسی بے لگام جذبۂ محبت کے سپرد نہیں کیا جاسکتا اس کی یقیناً کچھ حدود ہیں۔ آپ نے بعض معاملات میں جو دینی نوعیت کے بھی تھے اور تہذیبی نوعیت کے بھی، صحابہ کو اپنی پیروی یا نقل سے صریح لفظوں میں روکا ہے مثلاً صومِ وصال اور اپنی طرح کا لباس پہننا وغیرہ۔ ان واقعات کو ذرا اس نظر سے بھی دیکھیں کہ ان میں جذبۂ اتباع پر روک لگانے کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا بلکہ اس جذبے کے اظہار کی بعض ایسی صورتوں پر بندش لگائی گئی ہے جن کا جائز یا ناجائز ہونا موضوع نہیں بنایا گیا بلکہ ان میں بعض نقصانات کا اندیشہ ہونے کی وجہ سے ان سے روکا گیا۔ مثال کے طور پر صومِ وصال کی مخالفت میں یہ رنگ نہیں پایا جاتا کہ تمھارا یہ عمل گناہ تھا۔ اس سے توبہ کرو بلکہ اس کی مخالفت کا واضح محرک یہ تھا کہ اس سے تمھاری جسمانی قوت

گھٹ جائے گی اور اسی نوع کے بعض ضروری حقوق سے غافل کر دے گی یا ان کی ادائی کے قابل نہیں چھوڑے گی۔ جیسے سیدنا عثمان بن مظعون، سیدنا ابن مسعود اور بعض اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم کو شب بیداری اور صومِ مسلسل سے روکتے وقت آپ ﷺ نے یہی فرمایا تھا کہ تم میرے لائے ہوئے نظامِ حقوق و فرائض کی پاسداری کے لائق نہیں رہو گے۔ ایسی ممانعتوں سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ ایسے معمولات کا محرک بننے والا والہانہ جذبۂ اتباع خود اپنی جگہ درست نہ تھا۔

اب رہی حدودِ اتباع کی بات تو اس میں ایک اصول کو ضرور پیش نگاہ رکھنا چاہیے:

اصول: اتباع کے نام سے اطاعت کی حدود کو توڑا نہیں جا سکتا، کیونکہ اتباع اپنے نفس میں ذوقِ اطاعت ہی کی تکمیل ہے، اور جو جذبۂ تعلق اس کی اساس ہے، اس جذبے کی انتہائی شدت میں بھی آپ ﷺ کا رسول ہونا قلب اور ذہن میں مرکزیت کے ساتھ حاضر رہنا چاہیے۔ اس اصول کی روشنی میں اتباع کی متعیّن حدود بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔

رستے عام ہی ہوتے ہیں، کسی چلنے والے کے قدموں کے نشان انھیں خاص بنا دیتے ہیں۔ ایک سیدھی سادی زندگی کی راہ تھی جسے سب گزارتے آ رہے تھے لیکن جب میرے حضور ان راہوں پر چلے اور آپ کے وحی کے سانچے میں ڈھلے مزاجِ مبارک نے اپنا اظہار کیا تو ان راہوں کو منزلوں کی شان دے دی۔ یہ اظہار اخلاق میں بھی ہے، عادات میں بھی ہے اور طبعی امور میں بھی ہے تو ان سبھی میدانوں میں اتباع کرنا ہے۔ البتہ اس میں دھیان رکھا جائے گا کہ کون سی چیزیں لائق تلقین ہیں اور کون سی نہیں۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ کو دودھ مرغوب تھا تو اس رغبت کو خود میں پیدا کرنے کی خواہش اور کوشش بندگی کے بنیادی مزاج کا لازمہ ہے لیکن اگر اسی کو تلقین و تبلیغ کا موضوع بنایا جائے تو شاید خلافِ مصلحت ہو جائے گا۔ قانونی پیچیدگیوں سے صرف نظر کر کے دیکھیں تو اتباع کا سارا مقصد یہ ہے کہ ایک تو رسول اللہ ﷺ سے محبت کے تقاضے پورے ہو جائیں اور دوسرے وہ مزاج بندگی میسر آ جائے جس کا آپ ﷺ نمونۂ کامل تھے۔ مزاجِ بندگی کی ترکیب شاید کچھ ابہام رکھتی ہے اس لیے اس کے مفہوم کو متعیّن کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ اس اصطلاح سے ہماری مراد یہ ہے کہ نفس میں عبودیت کی طرف سے بنیادی مزاحمتوں کا ایسا خاتمہ ہو جائے کہ ہمارا بندہ ہونا ہمارے شعورِ ذات کے ہر حصے میں ایک ہی انداز سے سرایت کر جائے، یعنی ہم باعتبار ساخت؛ اللہ کے بندے بن جائیں جس کے وجود کی تمام قوتیں بندگی کی غایت کو اندر باہر سے پورا کرنے میں مرتکز

ہوں۔ انسانی شخصیت میں اور اس کی تشکیل کے ہر عمل میں طبیعت سب سے زیادہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے جو چیز ہماری طبیعت میں جگہ نہ بنائے ہم خود کو اس سے پوری طرح منسوب نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ ﷺ کے مزاجِ مبارک میں ڈھل جانے کی مسلسل کوششوں کے علاوہ اور کوئی ایسا راستہ ہمارے پاس نہیں ہے جس پر چل کر ہم بندگی کو اپنی طبیعت کے تمام داعیات کا واحد جوہر بنا سکیں۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ اتباع کے دائرے میں رسول اللہ ﷺ کی عاداتِ مبارکہ بھی آجاتی ہیں تاہم اس معاملے میں مشکل یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ کی ہر عادت اور ہر معاشرتی عمل لائق اتباع قرار پائے تو اس سے بعض بڑے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں اور معاشرت میں کچھ ایسی مشکلات آسکتی ہیں جو دین کے نظام العمل کو شاید ممکن ہی نہ رہنے دیں۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ ہم متعیّن کر کے بتائیں کہ اتباع کا دائرہ کن امور کا احاطہ کرتا ہے اور کون سی چیزیں اس سے باہر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت دو جہتیں رکھتی ہے، ایک جہت سے آپ ﷺ عرب تھے اور اس روایت میں رہتے ہوئے آپ ﷺ نے بعض اوضاع و اعمال اختیار فرمائے حتیٰ کہ بعض عادات بھی عرب ماحول ہی کی مناسبت سے آپ ﷺ کی شخصیت میں جگہ بنا پائیں۔ دوسری جہت یوں کہہ لیجیے کہ انسان کے لیے مثالیے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پہلو پر آپ ﷺ کی شخصیت میں عمومی بشری ساخت کی تکمیل ہوئی۔ عمومی بشریت سے مراد یہ ہے کہ انسانی نفس اور اس کے مرغوبات و معمولات کا وہ حصہ جو انسانوں میں بلاقید زمان و مکان مشترک اور مستقل ہے۔ اس میں نفس فطرت کے موقف پر کھڑا ہو کر کچھ عادتیں اور چند رویے اختیار کرتا ہے جن کا اظہار زندگی کی عام سطح اور پسند ناپسند کے بنیادی داعیات و جذبات کی کارفرمائی میں ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر رسول اللہ ﷺ کی تاریخی شخصیت کے خالص تہذیبی اور معاشرتی مظاہر میں سے اکثر اتباع کا موضوع نہیں ہیں لیکن آپ ﷺ کے ماورائے تہذیب انسانی مظاہر دراصل اتباع کے حقیقی مقاصد ہیں۔ مثلاً آپ ﷺ دراز گوش پر سوار ہوتے تھے، کھجور کی بعض اقسام کو پسند فرماتے تھے، عربی زبان بولتے تھے، ایک خاص ہیئت کے گھر میں رہتے تھے، کچھ جگہیں آپ ﷺ کو اچھی لگتی تھیں وغیرہ۔ یہ اتباع بمعنی نقل کا موضوع نہیں ہیں جبکہ دوسری طرف آپ ﷺ عموماً سر ڈھانپتے تھے، ازار او نچا رکھتے تھے، کھانے کی کچھ ہیئتوں پر کاربند رہتے تھے، ہمیشہ دائیں کروٹ سوتے تھے اور اٹھتے تھے، خوشبو پسند فرماتے تھے، مزاجِ مبارک میں ظرافت بھی تھی، طبعاً کمالِ زہد ہی پر رہنا مرغوب تھا، بچوں سے محبت فرماتے تھے، کشادہ رو تھے وغیرہ۔ یہ تمام افعال و

اعمال تقاضا کرتے ہیں کہ ہم ان کی اتباع کریں تاکہ بشریت کی مثالی ساخت حاصل کر سکیں، جو ہدایت میں ثابت قدم اور رو بکمال رہنے کے لیے شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان میں سے کچھ باقاعدہ سنتیں ہیں، ہم نے ایک مصلحت سے انھیں عادات و معمولات میں شمار کیا ہے۔ مختصر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے مزاج مبارک سے ہر نوع کی مناسبت پیدا کیے بغیر نہ انسانیت میں ترقی ممکن ہے نہ ہی عبدیت میں کمال کا کوئی امکان۔ ہم اپنی گزارشات کا اختتام حضرت قاری طیب صاحب قاسمی کے ایک اقتباس پر کریں گے۔ میلاد النبی ﷺ کی حقیقت نامی مضمون میں فرماتے ہیں :"حاصل یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے حقوق میں جو امت پر عائد ہوتے ہیں تین حقوق بنیادی ہیں: محبت، عظمت اور متابعت۔ اگر انسان عاشقِ رسول ہے لیکن مگر عظمت نہیں رکھتا تو وہ یقیناً اتلافِ حقوق کا مرتکب ہے۔ عظمت و بڑائی رکھتا ہے مگر محبت نہیں رکھتا تو وہ بھی حق تلف ہے اور اگر محبت و عظمت رکھتا ہے مگر متابعت نہیں رکھتا تو وہ بھی حق تلف ہے۔ ادائے حقوق کی صورت اس کے سوا نہیں کہ حضور ﷺ کی محبت و عظمت اور متابعت سے بیک وقت اس کا قلب و قالب منور ہو"۔

*****

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

محفلِ میلاد

سوال: السلام علیکم !محترم جناب ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ مختلف مقاصد کے لیے یا شکرانے کے لیے محفل میلاد منعقد کرتے ہیں جس میں دوسرے لوگوں خصوصاً عورتوں اور مدارس کے بچوں کو بلا کر آیت کریمہ یا قرآن یا پھر نعتیں پڑھتے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مدارس والے یہ بھی کہتے ہیں کہ اتنے قرآن ہم نے پڑھے ہوئے ہیں یہ بھی شامل کر لیں۔ کیا اس طرح کی محفل منعقد کرنا جائز ہے ؟

نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی محبت ایمان کا حصہ ہے، جو نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے محبت نہیں کرتا، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتا، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بتائے ہوئے راستے پر نہیں چلتا وہ مومن نہیں ہوسکتا۔

بخاری شریف میں ہے: ﴿عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ (بخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول صلى الله عليه وسلم من الإيمان) ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد اور اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں“۔

واضح رہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ہی شرک و بدعت کی شدید مذمت فرمائی۔ یہاں تک کہ اپنی قبر کو عبادت گاہ بنانے سے بھی منع فرمایا۔ ﴿عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ قَاتَلَ اللهُ الْيَهُودَ اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ﴾ (بخاری، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی البیعۃ) ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہودیوں کا ناس کر دے کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا“۔

لہذا نبی کریم ﷺ کی سیرت اور مدح کے نام پر جو محافل منعقد کی جاتی ہیں، ان میں جو جو منکرات ہوتے ہیں وہ ہر شخص پر عیاں ہیں، مثلاً عورتوں کا بلند آواز سے ترنم کے ساتھ نعتیں پڑھنا،[1] لاؤڈ اسپیکر کا بے دریغ استعمال کرکے اہلِ محلہ کو پریشان کرنا وغیرہ۔

بخاری شریف میں ہے: ﴿عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ﴾ (بخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده) ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا (پکا) مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان ایذا نہ پائیں“۔

مخصوص تاریخ میں اس محفل کا انعقاد کرنا جبکہ خاص ہیئت وصورت یا کسی خاص دن کوئی کام ضروری سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔[2] اس محفل کے انعقاد اور اس میں شرکت کو لازم سمجھنا جبکہ کسی امر مستحب کو لازم سمجھ کر اس پر اصرار کرنا بھی بدعت ہے تو جو کام صحابہ و تابعین بلکہ چھٹی صدی ہجری تک مسلمانوں نے نہیں کیا ہو اس کو لازم سمجھتے ہوئے کرنا کیسا ہو گا؟[3] رات کو دیر تک جاگ کر لنگر کھا کر بغیر فجر کی نماز پڑھے سونا۔ سنن ابی داؤد میں ہے: ﴿فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَكُمْ أَنْ لَا تُحْشَرُوا وَلَا تُعْشَرُوا وَلَا خَيْرَ فِي دِينٍ لَيْسَ فِيهِ رُكُوعٌ﴾ (سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والإمارة والفیء، باب ما جاء فی خبر الطائف) ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تو ہو سکتا ہے کہ تم جہاد کے لیے نہ نکالے جاؤ (کیونکہ اور لوگ جہاد کے واسطے موجود ہیں) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم سے زکوۃ نہ لی جائے (بالفعل کیونکہ ابھی ایک سال نہیں گزرا) لیکن وہ دین اچھا نہیں جس میں رکوع نہ ہو (نماز نہ ہو)“۔

مجلس کے اختتام پر سلام میں کھڑا ہونا اس عقیدے کے ساتھ کہ نبی اکرم ﷺ تشریف لائے ہوئے ہیں اور ہماری نقل و حرکت کو دیکھ رہے ہیں اور ارواحِ مشائخ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ روحیں حاضر ہوتی ہیں اور احوال کو جانتی ہیں کفر ہے کیونکہ حاضر و ناظر ہونا صرف اللہ رب العزت کی صفت ہے۔[4] نیز آپ ﷺ کو اپنی حیات میں اپنے لیے قیام

پسند نہیں تھا تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وفات کے بعد آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ناپسندیدہ عمل کو کرنے سے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی۔

سنن ترمذی میں ہے: ﴿عَنْ أَنَسٍ قَالَ لَمْ يَكُنْ شَخْصٌ أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنْ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ وَكَانُوا إِذَا رَأَوْهُ لَمْ يَقُومُوا لِمَا يَعْلَمُونَ مِنْ كَرَاهِيَتِهِ لِذَلِكَ﴾ (سنن الترمذی، كتاب الأدب عن رسول الله ، باب ما جاء فی كراهية قيام الرجل للرجل) ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے لیے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے بڑھ کر کوئی شخص محبوب نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ لوگ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو دیکھ کر کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اسے پسند نہیں کرتے''۔

اس موقعے پر روشنیوں اور زیبائش و آرائش کا استعمال ہوتا ہے جو کہ اسراف میں شامل ہے،[5] روضۂ اطہر کی شبیہ بنا کر اس کا طواف کرنا جبکہ کعبہ کے ساتھ تشبیہ دے کر کسی بھی مسجد یا مکان کا طواف کرنا ناجائز ہے اور اس میں کفر کا خطرہ ہے۔[6] نعتوں میں ایسا طرز اختیار کرنا کہ نعت اور گانے میں فرق باقی نہ رہے۔ البتہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرت کے بیانات، آپ کے ذکر خیر اور درود شریف وغیرہ پڑھنے کے لیے کسی مجلس کا انعقاد بغیر کسی دن اور وقت کے لزوم کے جائز بلکہ مستحسن ہے اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر روزانہ کم از کم سو بار درود شریف پڑھا جائے۔ آپ کے اخلاقِ کریمہ اور سیرت کے بیان کے لیے بارہا مجالس کا انعقاد کیا جائے، جس میں مذکورہ بالا خرافات، بدعات، منکرات و سیئات نہ ہوں۔[7]

1۔ نغمة المرأة عورة، وتعلمها القرآن من المرأة أحب قال عليه الصلاة والسلام (التسبيح للرجال، والتصفيق للنساء) فلا يحسن أن يسمعها الرجل (رد المحتار، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، مطلب في ستر العورة)

2۔ من البدع المنكرة ما يفعل في كثير من البلدان من إيقاد القناديل الكثيرة العظيمة السرف في ليال معروفة من السنة كليلة النصف من شعبان فيحصل بذلك مفاسد كثيرة منها مضاهاة المجوس في الاعتناء بالنار في الإكثار منها ومنها إضاعة المال في غير وجهه (تنقيح الفتاوى الحامدية، مسائل وفوائد شتى من الحظر والإباحة وغير ذلك، فائدة من البدع المنكرة)

3۔ قال الطيبي وفيه أن من أصر على أمر مندوب وجعله عزما ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال فكيف من أصر على بدعة أو منكر (مرقاة المفاتيح، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد)

4۔ من قال أرواح المشايخ حاضرة تعلم يكفر (البحر الرائق، كتاب السير، باب احكام المرتدين)

ونظير ذلك فعل كثير عند ذكر مولده ﷺ ووضع أمه له من القيام وهو أيضاً بدعة لم يرد فيه شيء (الفتاوى الحديثية، ص۵۸، مطبع: قديمی)

5۔ صرح أئمتنا الأعلام رضى الله تعالى عنهم بأنه لا يجوز أن يزاد على سراج المسجد سواء كان فى شهر رمضان أو غيره لأن فيه إسرافا كما فى الذخيرة وغيرها (تنقيح الفتاوى الحامدية، مسائل وفوائد شتى من الحظر والإباحة وغير ذلك، فائدة من البدع المنكرة)

6۔ قوله (بل يكره فى الصحيح) وظاهر كلامهم أنها تحريمية لأن الوقوف عهد قربة بمكان مخصوص فلم يجز فعله فى غيره كالطواف ونحوه ألا ترى أنه لا يجوز الطواف حول مسجد أو بيت سوى الكعبة تشبها كما فى غاية البيان وفى الكافى من طاف بمسجد سوى الكعبة يخشى عليه الكفر (حاشية الطحطاوى، كتاب الصلاة، باب احكام العيدين)

7۔ لا بأس بالجلوس للوعظ إذا أراد به وجه الله تعالى (الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس فى آداب المسجد)۔ (ب) الموالد والأذكار التى تفعل عندنا أكثرها مشتمل على خير، كصدقة، وذكر، وصلاة وسلام على رسول الله ﷺ ومدحه، وعلى شرّ بل شرور لو لم يكن منها إلا رؤية النساء للرجال الأجانب، وبعضها ليس فيها شرٌ لكنه قليل نادر، ولا شكّ أن القسم الأول ممنوع للقاعدة المشهورة المقررة أنّ درء المفاسد مقدَّم على جلب المصالح، فمن عَلِم وقوع شيء من الشرّ فيما يفعله من ذلك فهو عاص آثم، وبفرض أنه عمل فى ذلك خيراً، فربما خَيْرُهُ لا يساوى شَرَّهُ ألا ترى أن الشارع ﷺ اكتفى من الخير بما تيسر وفطم عن جميع أنواع الشر حيث قال: (إذا أمرتكم بأمر فأتوا منه ما استطعتم، وإذا نهيتكم عن شيء فاجتنبوه) فتأمله تعلم ما قررته من أن الشرّ وإن قلّ لا يُرَخَّصُ فى شيء منه، والخير يكتفى منه بما تيسر. والقسم الثانى سنَّة تشمله الأحاديث الواردة فى الأذكار المخصوصة والعامة. كقوله ﷺ: (لا يقعد قوم يذكرون الله تعالى إلا حفَّتهم الملائكةُ، وغَشِيَتْهُم الرحمة، ونزلت عليهم السكينة، وذكرهم الله تعالى فيمن عنده) رواه مسلم. وروى أيضاً أنه ﷺ قال لقوم جلسوا يذكرون الله تعالى ويحمدونه على أن هداهم للإسلام (أتانى جبريل عليه الصلاة والسلام فأخبرنى أن الله تعالى يُباهى بكم الملائكة) وفى الحديثين أوضح دليل على فضل الاجتماع على الخير والجلوس له (الفتاوى الحديثية، ص۱۰۹، مطبع: قديمی)

سوال: میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ میلاد منانا جائز ہے؟

جواب: نبی کریم ﷺ کی پیدائش سے بڑھ کر مسلمانوں کے لیے خوشی و مسرّت کا دن کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا، نبی ﷺ کی ولادت بڑے سرور اور فرحت کا باعث ہے اور یہ سرور کسی وقت اور محل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر مسلمان کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے جب آپ ﷺ کی ولادت کی خبر ابولہب کو پہنچائی تو اس کی خوشی میں ثویبہ کو آزاد کر دیا، مرنے کے بعد لوگوں نے ابولہب کو خواب میں دیکھا اور اس سے حال دریافت کیا تو اس نے کہا کہ جب سے مرا ہوں عذاب میں گرفتار ہوں مگر پیر کی شب کو چونکہ میں نے میلادِ نبی کی خوشی کی تھی اس لیے عذاب میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ ﴿قَالَ عُرْوَةُ وثُوَيْبَةُ مَوْلَاةٌ لِأَبِي لَهَبٍ كَانَ أَبُولَهَبٍ أَعْتَقَهَا فَأَرْضَعَتْ النَّبِيَّ ﷺ فَلَمَّا مَاتَ أَبُولَهَبٍ أُرِيَهُ بَعْضُ أَهْلِهِ

بِشَرِّ حِيبَةٍ قَالَ لَهُ مَاذَا لَقِيتَ قَالَ أَبُو لَهَبٍ لَمْ أَلْقَ بَعْدَكُمْ غَيْرَ أَنِّي سُقِيتُ فِي هَذِهِ بِعَتَاقَتِي ثُوَيْبَةَ﴾ (بخاری، کتاب النکاح، باب و أمهاتكم اللاتي أرضعنكم) ترجمہ: ’’ عروہ کہتے ہیں کہ ثویبہ ابولہب کی لونڈی تھی جسے ابولہب نے آزاد کر دیا پھر اس نے آپ ﷺ کو دودھ پلایا تھا، جب ابولہب مر گیا تو کسی گھر والے نے اس کو خواب میں برے حال میں دیکھا تو پوچھا کہ تجھ سے کیا معاملہ کیا گیا، جواب دیا جب سے تم سے جدا ہوا ہوں سخت عذاب میں مبتلا ہوں، ثویبہ کے آزاد کرنے کی وجہ سے تھوڑا سا پانی مل جاتا ہے، جس سے میری پیاس بجھ جاتی ہے‘‘۔

جب ابولہب جیسے کافر کے لیے میلادِ نبی ﷺ کی خوشی کی وجہ سے عذاب میں تخفیف ہوگئی تو جو کوئی امتی آپ کی ولادت کی خوشی کرے اور حسب وسعت آپ کی محبت میں خرچ کرے تو کیونکر اعلیٰ مراتب حاصل نہ کر سکے گا۔ اگر ولادت معجزات یا غزوات کا ذکر بطرز وعظ و درس بغیر پابندیِ رسوم بغیر تعیینِ ایام و بلا التزام طریقۂ خاص کے کرے تو ہزاروں برکتوں کا باعث ہوگا۔ لہذا نبی ﷺ کا ذکرِ خیر، آپ کی سیرت کی محافل منعقد کرنا، آپ کی ولادت کی خوشی منانا ممنوع نہیں، البتہ تعیینِ ایام، بے جا اسراف، پوری پوری رات محافل کا انعقاد، نمازوں سے غفلت، مردوں عورتوں کا اختلاط، لائٹوں اور قمقموں کا انتظام، ناچ گانا، کیک کاٹنا، عید کی نماز پڑھنا یہ سارے امور بدعات میں سے ہیں ان سے اجتناب ضروری ہے۔ اس زمانے میں جو جشنِ عیدِ میلاد النبی ﷺ رائج ہے اس کا ثبوت تو نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں نہ ہی کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی کوئی بات ثابت ہے۔ نیز نبی کریم ﷺ کا بنفس نفیس محفل میلاد میں شرکت کا اعتقاد غلط عقیدہ ہے۔[8] اس کے علاوہ شیرینی کی تقسیم کا لزوم[9] معین مہینے کی معین تاریخ میں مجلس منعقد کرنے کا لزوم اسے بدعت بناتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿لَا تَخْتَصُّوا لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِيَامٍ مِنْ بَيْنِ اللَّيَالِي وَلَا تَخُصُّوا يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِيَامٍ مِنْ بَيْنِ الْأَيَّامِ﴾ (مسلم، کتاب الصیام، باب کراهة صیام یوم الجمعة منفردا) ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ راتوں میں سے جمعے کی رات کو قیام کے ساتھ مخصوص نہ کرو اور نہ ہی دنوں میں سے جمعہ کے دن کو روزے کے ساتھ مخصوص کرو۔

اس کے علاوہ کئی امور ایسے ہیں جس کی بنا پر میلاد کی مروجہ محافل قائم کرنا بدعت ہے۔ البتہ ان خرافات کو ختم کر کے نفسِ ذکرِ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بہت ثواب کا کام ہے۔ لہذا اگر کوئی شخص مروجہ میلاد کی محافل میں پائی جانے والی خرابیوں کے باعث مروجہ طریقہ پر میلاد نہیں مناتا تو وہ گناہ گار نہیں بلکہ بدعت سے بچنے کا ثواب اس کو ملے گا لیکن اس میں غلو کرتے ہوئے نفس ذکر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ہی ناجائز سمجھنا محرومی اور کم نصیبی کی بات ہے۔

8۔ من قال أرواح المشایخ حاضرة تعلم یکفر (البحر الرائق، کتاب السیر، باب أحکام المرتدین)

9۔ کل مباح یؤدی إلیه فمکروه (الدر المختار، کتاب الصلاة، باب سجود التلاوة)۔

سوال: السلام علیکم! عید میلاد کے متعلق علمائے دیوبند کیا فرماتے ہیں؟

علمائے دیوبند کا موقف یہی ہے کہ میلاد کے موقعے پر مروجہ طرز سے عید منانا اور اسے حبِ رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا لازمی تقاضا سمجھنا، اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ نہ منانے والوں کو ابلیس کہنا ایک ایسی بدعت سَیِّئَة ہے جو عہدِ نبوی، عہدِ صحابہ، تابعین و تبع تابعین کہیں سے ثابت نہیں۔ حبِ رسول کا اصل تقاضا یہ ہے کہ سنت رسول کی پیروی کی جائے، یہ نہیں کہ شور شرابا، نعرے بازی، محافلِ نعت کی آڑ میں موسیقی اور بغض افشانی کرتے رہیں۔ مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہے: ’’جشنِ عیدِ میلاد کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، البتہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ذکرِ مبارک اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرتِ طیبہ کو سننے اور سنانے کے لیے کوئی مجلس کسی خاص دن یا تاریخ کی قید کے بغیر منعقد کی جائے تو درست ہے بشرطیکہ اس کا مقصد آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ذکرِ مبارک سے برکت حاصل کرنا اور سیرتِ طیبہ پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا ہو، نام و نمود مقصود نہ ہو‘‘۔ (فتاویٰ عثمانی: ۱/ ۵۱)

سوال: روضۂ رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر حاضری کے آداب اور درود و سلام پیش کرنے کا صحیح طریقہ بتا دیں اور کونسا درود سلام پڑھنا چاہیے یا جس کی فضیلت زیادہ ہو وہ بتا دیں؟

جواب: حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہ نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے روضۂ اطہر پر حاضری کے آداب، درود و سلام پیش کرنے کے الفاظ اور طریقے اپنی کتاب ’’رفیق حج‘‘ میں ذکر فرمائے ہیں وہاں تفصیل دیکھیں۔ مختصراً چند آداب اور درود و سلام کے صیغے ذکر کیے جاتے ہیں: جب آدمی مدینہ منورہ کی طرف چلے تو درود شریف کثرت سے پڑھتا رہے اور جوں جوں قریب ہوتا جائے اور زیادہ کثرت کرتا جائے۔ مستحب یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے پہلے غسل کرے، پاک صاف عمدہ لباس جو

پاس موجود ہو پہنے۔ اگر نئے کپڑے ہوں تو بہتر ہے خوشبو لگائے۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے پیادہ چلے اور اس شہر کی عظمت کا خیال کرتے ہوئے نہایت خشوع و خضوع، تواضع، ادب اور حضور قلب کے ساتھ درود شریف پڑھتا ہوا داخل ہو اور یہ پیشِ نظر رکھے کہ یہ وہ زمین ہے جس پر جابجا رسول اکرم ﷺ کے قدم مبارک لگے ہوئے ہیں۔ جب مسجد نبوی میں داخل ہونے لگے تو بابِ جبرئیل سے داخل ہو اور پہلے دایاں پاؤں رکھے اور درود شریف پڑھ کر اللّٰهُمَّ افْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ پڑھے، پھر پہلے ریاض الجنۃ میں آکر دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے۔ یہ وہ جگہ ہے جو قبر شریف اور منبر شریف کے درمیان ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: ﴿مَا بَيْنَ بَيْتِي وَمِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ﴾ (بخاری، كتاب الجمعة، باب فضل ما بين القبر والمنبر) ترجمہ: ”میرے گھر اور منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے“۔

تحیۃ المسجد سے فارغ ہو کر اللہ تعالیٰ کا اپنی حاضری کی توفیق اور سعادت بخشی پر شکر ادا کرے اور اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار کرے۔ اس کے بعد روضۂ اقدس کے پاس حاضر ہو اور سرہانے کی دیوار کے کونے میں جو ستون ہے اس سے تین چار ہاتھ کے فاصلے پر کھڑا ہو، نہ بالکل جالیوں کے پاس جائے اور نہ ہی زیادہ دور اس طرح کہ رخ روضۂ اقدس کی طرف اور پشت قبلہ کی طرف ہو اور یہ تصور کرے کہ آں حضرت ﷺ لحد شریف میں قبلہ کی طرف چہرہ مبارک کیے ہوئے لیٹے ہیں اور پھر نہایت ادب کے ساتھ درمیانی آواز سے، نہ بہت پکار کر اور نہ بالکل آہستہ سلام کرے یہاں چند الفاظ درود و سلام لکھے جاتے ہیں:

اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَا رَسُوْلَ الله،اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَا حَبِيْبَ الله ،اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَا خَلِيْلَ الله،اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَا خَيْرَ خَلْقِ الله، اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَا صَفْوَةَ الله،اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَا خِيَرَةَ الله،اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَا سَيِّدَ الْمُرْسَلِيْنَ ، اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَا إِمَامَ الْمُتَّقِيْنَ ،اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَا مَنْ أَرْسَلَهُ اللهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ،اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَا شَفِيْعَ الْمُذْنِبِيْنَ، اَلسَّلَامُ عَلَيْکَ يَا مُبَشِّرَ الْمُحْسِنِيْنَ (غنية الناسک فی بغية المناسک لمحمد حسن شاه المهاجر المكي،ص:۳۸۷،ادارة القرآن والعلوم الاسلامية)

درودِ ابراہیمی کا ورد رکھے اور مسنون اعمال کی پابندی، کثرتِ تلاوت کا اہتمام اور توبہ و استغفار کرے۔

سوال: جناب محترم! کیا "یارسول اللہ" کہنا صحیح ہے؟ برائے مہربانی میں یہ جاننا چاہتا ہوں کیونکہ میں نے سنا ہے کہ یہ الفاظ کہنا درست نہیں ہے۔ جزاک اللہ

جواب: یارسول اللہ کسی درود وغیرہ کے ساتھ اس نیت سے کہنا کہ ملائکہ اس درود کو حضور ﷺ تک پہنچادیں، جائز ہے۔ حدیث مبارکہ ہے: ﴿عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِنَّ لِلهِ مَلَائِكَةً سَيَّاحِينَ فِي الْأَرْضِ يُبَلِّغُونِي مِنْ أُمَّتِي السَّلَامَ﴾ (سنن النسائی، کتاب السھو، باب السلام علی النبی ﷺ) ترجمہ: عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلاشبہہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے زمین میں گھومتے رہتے ہیں اور میری امت کا سلام مجھ تک پہنچاتے ہیں۔ شعب الایمان میں ہے: ﴿مَنْ صَلَّى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِي سَمِعْتُهُ، وَمَنْ صَلَّى عَلَيَّ نَائِيًا أُبْلِغْتُهُ﴾ (شعب الایمان، تعظیم النبی ﷺ واجلالہ ترجمہ: "جو مجھ پر میری قبر کے پاس درود بھیجتا ہے میں اس کو سنتا ہوں اور جو دور سے مجھ پر درود بھیجتا ہے، وہ مجھ تک پہنچادیا جاتا ہے"۔ لیکن یہ عقیدہ رکھنا کہ حضور ﷺ حاضر وناظر ہیں، ہر جگہ سے یارسول اللہ پکارنے والے کی پکار کو سن کر از خود سن لیتے ہیں، درست نہیں، کیونکہ حاضر وناظر ہونا صرف اللہ کی صفت ہے۔ لہٰذا ترک میں احتیاط ہے۔

امداد الفتاویٰ میں ہے: سوال: دلائل الخیرات کی حزبِ ششم یومِ شنبہ میں جو یہ عبارت واقع ہے "یا حبیبنا یا سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ" اس کا پڑھنا جب کہ قاری روضۂ مبارک پر حاضر نہ ہو کیسا ہے؟

جواب: ایسے صیغے بہ نیت تبلیغِ ملائکہ جائز ہیں مگر میں نے احتیاط کی ہے کیونکہ عوام میں مفاسد ہوگئے ہیں۔ (امداد الفتاویٰ از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ، جلد۵، ص۴۰۷، بعنوان صیغۂ خطاب سے درود شریف کا جواز مع تاویل، طباعت: مکتبہ دارالعلوم کراچی)

جاری ہے

*****

محمد ایاز
معاون قلم کار

کشمیر، شام اور افغانستان

امتِ مسلمہ کو ہر دور میں مختلف مسائل کا سامنا رہا ہے۔ ان مسائل کی نوعیت اور صورتیں اگرچہ مختلف رہیں لیکن ان کے اسباب و وجوہات میں ایک چیز تقریبا ہر دور میں مشترک رہی: عدمِ اتحاد و یکجہتی۔ مسلمان جب متحد تھے تو ملک کیا پورے پورے براعظموں پر عدل و مساوات کا نظام قائم کیے رکھتے تھے، لیکن جیسے جیسے اتحاد اور یکجہتی کا فقدان فقدان، اجتماعی مفادات پر ذاتی مفادات کی ترجیح اور امت پن کے تصور میں کمزوری آتی گئی مسلمانوں کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔ آج امتِ مسلمہ کو جتنے بھی مسائل کا سامنا ہے یکجہتی اور ایک امت ہونے کے تصور کا فقدان ہی اس کی اصل وجہ ہے۔ شام، فلسطین، عراق، افغانستان، یمن، کشمیر، نکورو کاراباغ وغیرہ آج کے زندہ مسائل ہیں جس کا امتِ مسلمہ کو سامنا ہے۔ اس کے علاوہ نسلی مسائل جو برما، چین وغیرہ میں موجود ہیں ان کی ایک الگ فہرست ہے۔ ان مسائل میں یہ تو بالکل عیاں ہے کہ پسِ پردہ عالمی طاقتوں کا ہاتھ ہے، چاہے وہ شام ہو جہاں ایک درجن کے قریب علاقائی اور عالمی طاقتیں خانہ جنگی کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں یا افغانستان، عراق اور فلسطین ہو جہاں عالمی مفادات کی خاطر مختلف طاقتیں زور آزمائی کر رہی ہیں ،لیکن ایک چیز جس پر نہ ہم سوچتے ہیں نہ خود کو اس حوالے سے مجرم گردانتے ہیں کہ ہم ہی کہیں نہ کہیں ان مسائل کے ذمے دار ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ مڈل ایسٹ اور سنٹرل ایشا کی جغرافیائی اہمیت اور معدنیات نے ان طاقتوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے لیکن کیا دنیا کے ۵۶ اسلامی ممالک میں یہ سکت نہیں ہے کہ وہ یکجہتی اور بھائی چارے کا ثبوت دے کر اس خطے

کے ذخیرۂ معدنیات اور جغرافیائی اہمیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر عالمی اقوام کے مد مقابل آسکیں۔امریکہ اگر چند ریاستوں کو اکھٹا کر کے دنیا کو تابع بنا سکتا ہے، یورپی ممالک اگر یونین بنا کر پوری دنیا کو اپنی مرضی پر چلانے کے لیے مجبور کر سکتے ہیں تو مسلمان متحد ہو کر اقوامِ عالم کی ہم سری کیوں نہیں کر سکتے؟ یہ جانتے ہوئے کہ یہ مشکل کام ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر اس کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔اس کے لیے مضبوط عزم اور ایک عظیم ولولے کی ضرورت ہے جو الحمد اللہ مسلمان قوموں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔بس ہمت کی دیر ہے، سوچ و فکر کا محور ذاتی مفادات سے بلند کر کے اجتماعی مفادات کو ترجیح دینی ہے۔اگر مسلمان ریاستیں اجتماعی طور پر یہ کام کر لیتی ہیں تو اس وقت یہ کام سہل سے سہل ہوتا چلا جائے گا۔

نوجوانانِ ملت کی آگاہی و بیداری کے لیے ہم گاہے گاہے مسلم دنیا کے مسائل اور ان کا پس منظر بیان کرتے رہیں گے۔اس بار ہم کشمیر، شام اور افغانستان کے حوالے سے اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں:

کشمیر

۱۹۴۷ء میں برطانیہ سے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ دو خود مختار ریاستیں پاکستان اور بھارت وجود میں آئیں، آس پاس آباد چھوٹی ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے عوام کی منشا کے مطابق کسی بھی ملک میں شامل ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہیں ۔چونکہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس لیے وہاں کے مسلمان پاکستان سے الحاق چاہتے تھے لیکن وہاں سکھوں کی حکومت تھی۔جس نے مسلمانوں کی مرضی کے برعکس ہندوستان کا ساتھ دیا۔واقعہ کچھ یوں تھا کہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی پاکستان کی آزادی کے اگلے دن مہاراجہ نے پاکستان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے رو سے معاملات کو جوں کا توں رکھا جانا تھا لیکن معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مہاراجہ کی طرف سے جموں اور پونچھ کے شہریوں کو حکم ملا کہ وہ علاقہ خالی کر دیں اور پھر یہ بھی انتظار نہ کیا گیا کہ وہاں کے باشندگان نقل مکانی کرتے، ہندو اور سکھ بلوائیوں کو کھلی چھوٹ دے دی گئی جنھوں نے اہلِ کشمیر کے گھروں کو مسمار، نذرِ آتش اور یہاں کے باشندوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، ٹائمز آف لندن کے اعداد و شمار کے مطابق ۲ لاکھ ۳۷ ہزار افراد قتل کیے گئے،اسی طرح آئن اسٹیفن نے اپنی کتاب ''ہارنڈ مون'' میں مقتولین کی تعداد ۲ لاکھ بتائی

ہے، ایک اور کتاب ”انڈر سٹینڈ کشمیر اینڈ کشمیریز“ جو آکسفورڈ یونیورسٹی سے چھپی ہے جس کے مصنف سٹڈن کرسٹوفر نے بھی یہ تعداد لاکھوں میں بتائی ہے، اس قتل عام کا اعتراف ”دی ہندو“ کے رپورٹر لوپوری نے اپنی کتاب ”اکراس دی لائن آف کنٹرول“ میں کیا ہے اور اس سانحے کی گواہی ”کشمیر لائف“ میں وید بھیسن نے بھی دی ہے۔ نہ صرف یہ کہ مہاراجہ نے کشمیری مسلمانوں کو آر ایس ایس اور اکالی دل کے جھتوں کے ذریعے قتل کروایا بلکہ ریاست پٹیالہ سے فوجی دستے طلب کر کے پاکستان کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی دھجیاں اڑادی گئی۔ اس کا اعتراف میجر جنرل ڈی کے پلٹ کی کتاب ” ہسٹری آف جموں کشمیر رائفلز“، رابرٹ ورسنگ کی کتاب ”انڈیا، پاکستان اینڈ دی کشمیر ڈسپیوٹ“ اور لیفٹننٹ جنرل ایل پی سین کی کتاب ”کشمیر کنفرٹیشن“ میں موجود ہے اور اس سے بڑھ کر خود بھارتی وائٹ پیپر میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ مہاراجہ نے معاہدے کے برخلاف کشمیریوں کو بے دخل کرنے کا حکم دیا اور مختلف ہندو اور سکھ تنظیموں نے فوج سمیت کشمیر پر چڑھائی کی جس کے بعد قبائل کے غیور مسلمان، اپنے نہتے کشمیری بھائیوں کی مدد کو آگے بڑھے۔ کشمیر کا ایک حصہ ڈوگرہ راج سے آزاد کرالیا گیا۔ جب انڈیا مجاہدین کے ہاتھوں پٹ رہا تھا تو روایتی مکاری کا سہارا لے کر اقوامِ متحدہ پہنچ گیا جس کی مداخلت سے اس شرط پہ جنگ بندی کرائی گئی کہ کشمیری عوام کو حق خود ارادیت دیا جائے اور عام استصواب رائے سے کشمیری عوام کی مرضی معلوم کی جائے کہ وہ پاکستان اور انڈیا میں سے کس کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں۔ لیکن بعد میں انڈیا مختلف حیلوں بہانوں سے استصوابِ رائے کو ٹالتا رہا بلکہ اب تو اپنی پوزیشن مضبوط کر کے رائے شماری سے منحرف ہو کر کشمیر کے بھارتی اٹوٹ انگ ہونے کا راگ الاپ رہا ہے۔ بہر حال کشمیر جب سے اب تک لہوں لہان ہے، خصوصاً پچھلے ایک سال سے بنیادی انسانی ضروری اشیا تک بھی کشمیریوں کی رسائی نہیں ہے اور اس کا اعتراف یورپی یونین، امریکہ، او آئی سی سب کرتے ہیں۔

شام

شام میں اس وقت بشار الاسد کی حکومت ہے یہ علوی نُصیری فرقے سے تعلق رکھتا ہے جو کل آبادی کا ۱۰ سے ۱۵ فیصد ہے اس ۱۵ فیصد اقلیت نے ۸۵ فیصد اکثریت کو بدترین استحصال اور ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ اس کی ظلم و بربریت کا اندازہ یتیم، بیواؤں اور بے گھر ہونے والوں کی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے شام کی موجودہ صورتحال یہ ہے کہ کئی شہر نیست و

نابود ہوگئے ہیں ۵ لاکھ سے زیادہ افراد جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں لاکھوں افراد معذور اور اس سے کئی گنا زیاہ بے گھر ہیں ،آدھی سے زیادہ آبادی قریبی ممالک اور شام کے مضافات میں مہاجرت کے دن گزارر ہے ہیں، چونکہ شام خانہ جنگی کا شکار رہااور دنیا کی تمام طاقتوں نے شام کو اکھاڑا سمجھ کر زور آزمائی کی یہی وجہ ہے کہ یہاں ظلم و بربریت کے وہ نشان موجود ہیں جس سے انسانیت شرما جائے۔ ہسپتال، درسگاہ مسجد کوئی بھی ایسی جگہ جسے عوام الناس میں تقدیس حاصل ہو، نہیں چھوڑی گئی ۔اس کے مرکزی کرداروں میں روس، امریکہ، شام، ایران اور اسرائیل سمیت داعش وغیرہ شامل ہیں۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ لاکھوں لوگ بے یارو مدد گار کھلے آسمان کے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں پاکستان ترکی اور دیگر اسلامی ممالک ان مہاجرین کی خدمت میں پیش پیش ہیں فاتح فاؤنڈیشن پاکستان نے حال ہی میں ادلب اور دیگر شہروں میں پانی اور خوراک کی مستقل بنیادوں پر ترسیل کا انتظام کیا ہے۔

افغانستان

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں دھماکے ہوئے، اس وقت کے صدر جارج بش نے اس کا ذمے دار القاعدہ کو ٹھہراتے ہوئے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اندھا دھند بمباری اور تباہ کن میزائلوں سے دھرتی کو بھسم کر دیا گیا۔ طالبان حکومت نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی حکومت کو ساقط کر دیا اور گوریلا جنگ کا راستہ اختیار کیا۔ اور اتحادی افواج کو بے پناہ نقصانات پہنچاتے رہے۔ کئی علاقوں پر طالبان کا کنٹرول واپس آگیا ہے۔ یہ جنگ ۲۰ سال جاری رہنے کے بعد بالآخر امریکی شکست کے ساتھ انجام کو پہنچی ہے کیونکہ جنگ میں ہار اور جیت کا تعین مقاصد کے حصول کے پیمانے کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے، اگر امریکی مقاصد کا جائزہ لیا جائے تو اس میں امریکہ ناکام دکھائی دیتا ہے حالانکہ امریکہ کو اس جنگ میں دو درجن سے زائد ممالک کی فوجی حمایت بھی حاصل تھی جبکہ مقابلہ ایک غیر تربیت یافتہ گروہ سے تھا۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اس جنگ کی وجہ سے افغانستان کو جن مشکلات مصائب اور آلام سے گزرا پڑا وہ بہت زیادہ ہیں کیونکہ ہلاکتوں کی تعداد لاکھوں میں ہے، معذور بے گھر ہونے والوں کی بھی کمی نہیں۔ لیکن حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ اب یہ جنگ امریکی پسپائی کے ساتھ ختم ہونے جا رہی ہے۔ عالمی سطح پر طالبان کی سیاسی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ امریکہ افغان مذاکرات کے کئی دور مکمل ہو چکے

ہیں۔ مذاکرات کی شرائط کے مطابق بہت سارے قیدی رہا کر دیے گئے۔ امریکہ نے اسی سال افغانستان سے فوجی انخلا کا اغاز کیا ہے جو تا حال جاری ہے صدر ٹرمپ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ وہ ۲۵ دسمبر سے پہلے پہلے تمام فوج نکال لے گا۔ غیر ملکی افواج کے انخلا کے بعد کے افغانستان کی سیاست میں طالبان کا اہم کردار متوقع ہے۔ اس جنگ میں امریکہ کو جانی اور مالی دونوں اعتبارات سے بھرپور خسارہ ہوا۔ امریکی وزارت دفاع کے مطابق افغانستان میں اکتوبر ۲۰۰۱ء سے مارچ ۲۰۱۹ء تک فوجی اخراجات ۷۶۰ ارب ڈالر تھے۔

*****